انتظار حسین

# کچھوے

کچھوے

# کچھوے

انتظار حسین

مطبوعات، لاہور

| | |
|---|---|
| مُصنّف | انتظار حسین |
| ناشرین | خالد احمد، نجیب احمد |
| مکتبہ | مطبوعات، ۶۔ اے نسبت روڈ، لاہور |
| مطبع | شرکت پرنٹنگ پریس۔ لاہور |
| بار اوّل | ۱۹۸۱ء |
| تعداد | ایک ہزار |
| قیمت | ۲۵ روپے |

سرورق : مُوجد

# انتساب

پھر نارد نے پوچھا: "اچھا، روشنی سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہے؟"

"ہاں ہے"۔ سنت کمار نے کہا۔ "ہوا روشنی سے بڑھ کر ہے کہ آدمی ہوا میں پیدا ہوا، ہوا ہی میں پلا بڑھا، ہوا ہی میں جیتا ہے۔ ہوا ہی کے کارن ہم بولتے ہیں، سُنتے ہیں۔"

"اچھا! ہوا سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہے؟"

"ہاں ہے۔ یاد ہوا سے بڑھ کر ہے کہ آدمی سے اس کی یاد چھین لو۔ پھر نہ وہ سُنے گا، نہ سوچے گا، نہ سمجھے گا۔ اس کی یاد اُسے لوٹا دو، سنے گا، سوچے گا، سمجھے گا۔"

# فہرست

# قدامت پسند لڑکی

وہ چست قمیص پہنتی تھی اور اپنے آپ کو قدامت پسند بتاتی تھی۔ کرکٹ کھیلتے کھیلتے اذان کی آواز کان میں پہنچ جاتی تو دوڑتے دوڑتے رک جاتی، سر پہ آنچل ڈال لیتی اور اس وقت تک باؤلنگ نہیں کرتی جب تک اذان ختم نہ ہو جاتی۔

یہ اس لڑکی کا ذکر ہے جو مہاتما بدھ کی پیرو تھی اور تیسوں روزے رکھتی تھی۔ لیکچر کا پروگرام ہو یا کرکٹ کا میچ، روزہ اس کا کبھی قضا نہیں ہوا۔ گولے کی آواز پہ وہ پرس سے الائچی نکالتی، روزہ افطارتی اور پھر مصروف ہو جاتی۔ اور انٹر کالجیٹ تقریری مقابلے میں ایک مرتبہ وہ صرف اس وجہ سے ہار گئی تھی کہ جب اس کی باری آئی تو مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ اور وہ نماز قضا نہیں کر سکتی تھی۔

مگر وہ فرقہ پرست نہیں تھی۔ وہ مہاتما بدھ کی پیرو تھی اور انسان دوستی اس کا مسلک تھا؛ یہ الگ بات ہے کہ اس نے محسن کو جو سوئٹر اپنے ہاتھ سے بن کر دیا تھا اس کا مطلب محسن نے انسان دوستی کے سوا کچھ جانا۔ یہ سوئٹر پہن کر اس نے جذبے کی گرمی محسوس کی اور ایک قدم آگے

بڑھادیا، مگر اسے فوراً ہی پیچھے ہٹنا پڑا۔ محسن نے معذرت کی اور ساجدہ نیاز نے جواب دیا:

"میں مہاتما بدھ کی پیرو ہوں اور معاف کر دیا کرتی ہوں۔"

اس جواب سے محسن کو بہت ڈھارس ہوئی۔ وہ خود بھی تو تلوار سے اسلام پھیلانے کا قایل نہیں تھا۔ اس نے امن و آشتی کی فضا میں اپنے جذبے کی خاموش تبلیغ کا تصور کیا اور مطمئن ہو گیا۔ جذبے کی خاموش پُرامن تبلیغ سے اس نے چند دنوں میں زمین کو ہموار پایا اور تجویز پیش کی کہ "چلو پکچر دیکھیں۔"

اس نے اسے غور سے دیکھا اور سنجیدگی سے بولی: "دیکھیے میں بہت قدامت پسند ہوں۔"

محسن کو ایک دفعہ پھر معذرت کرنی پڑی۔ اور چونکہ وہ مہاتما بدھ کی پیرو تھی، اس نے اسے معاف کر دیا۔

چند دنوں میں اس نے کھویا ہوا اعتماد پھر پا لیا۔ اور ایک روز جب وہ ملے تو موسم بہت خوش گوار تھا۔ اس نے موسم کو اشارۂ غیبی جانا اور تجویز پیش کی کہ "دریا پہ چلیں۔"

وہ پھر سنجیدہ ہو گئی اور بولی: "دیکھیے میں بہت قدامت پسند ہوں اور مردوں کے ساتھ بوٹنگ نہیں کیا کرتی۔"

محسن نے جب یہ مقدمہ اشرف کے سامنے پیش کیا تو وہ بہت ہنسا: "لڑکی اور قدامت پسند۔"

"ہاں یار وہ بہت قدامت پسند ہے۔"

اشرف ہنستے ہنستے رکا اور سنجیدگی سے کہا: "احمق، لڑکی کبھی قدامت پسند نہیں ہوتی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ لڑکی تاریخ میں کبھی قدامت پسند نہیں ہوئی قدامت پسند صرف دو چیزیں ہوتی ہیں: بوڑھی عورت اور تو خیز لڑکا۔ تیسری کوئی مخلوق قدامت پسند نہیں ہوتی۔"

محسن نے اشرف کے نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کیا۔ اشرف کا ان معاملات میں نقطہ نظر اتنا مختلف تھا کہ محسن کو اس سے کبھی اتفاق نہ ہو سکا۔ اشرف رومانٹک ہونے کے سخت خلاف تھا

یہاں تک کہ جب صفیہ نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کا تہیہ کیا اس وقت بھی وہ رومانٹک نہیں ہوا۔ اور صفیہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: ”میں نے تو نیند کی گولیاں کھائیں اور بچ گئی مگر تم ایک دن شاہی مسجد کے مینار سے کود کر خودکشی کرو گے۔“

اشرف نے نہایت سادگی سے جواب دیا: ”نہیں۔ میں شاہی مسجد کے مینار پر چڑھا ہوں خودکشی کے لیے وہ نہایت نامناسب مقام ہے۔“

مگر ایسا بھی نہیں کہ اشرف کو خودکشی کا خیال کبھی آیا ہی نہ ہو۔ عطیہ کی خاطر وہ خودکشی کرنے کے لیے سچ مچ تیار ہو گیا تھا۔ کئی دن وہ اس خیال سے باؤلا بنا پھرتا رہا۔ مگر وہ بے سوچے سمجھے قدم اٹھانے کا قائل نہیں تھا۔ اس نے متانت سے اپنے اس جذبے پر غور کیا اور پھر اس کا ذکر سید حسن سے کیا۔ سید حسن نہایت ثقہ اور سمجھدار آدمی تھے اور آزادیِ اظہار کے سخت حامی۔ انھیں یہ بات معلوم تھی کہ خودکشی بھی اظہارِ ذات کی ایک صورت ہے۔ پس انہوں نے اس میں براہِ راست مخل ہونا اپنے اصول کے خلاف جانا، البتہ اتنا کہا: ”ڈاکٹر اصغر سے مشورہ کیا؟“

”نہیں۔“

”کر لو۔“

یہ بات اشرف کے دل کو بہت لگی۔ وہ فوراً ڈاکٹر اصغر کے پاس گیا۔ جب وہ وہاں سے واپس آیا اس کا ارادہ بدل چکا تھا ”بات یہ ہے،“ اس نے نہایت متانت سے کہا، ”میں نے اپنی الجھن کو سمجھ لیا ہے۔ میں اصل میں اڈیپس کمپلیکس کا شکار ہوں۔ میری والدہ مرحومہ کا رنگ سانولا تھا اور عطیہ کی رنگت بھی سانولی ہے۔“

یوں اس کے بعد بھی اشرف سانولی لڑکیوں کے پیچھے دیوانہ ہوتا رہا۔ مگر اس نفسیاتی بصیرت کے ساتھ کہ وہ اڈیپس کمپلیکس کا شکار ہے۔ اور اس لیے خودکشی کے خیال نے اسے پھر کبھی نہیں گھیرا۔

سید حسن کسی کمپلیکس کا شکار نہیں تھے۔ ان میں ثقافت اور دانشوری اس درجہ فراواں تھی کہ وہ کسی کمپلیکس میں مبتلا ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ البتہ وہ لندن کے ناسٹلجیا میں مبتلا تھے۔ شام

کو وہ روز برٹش کونسل محض اس وجہ سے جاتے تھے کہ وہ گوشہ انہیں لندن کا گوشہ لگتا تھا۔ لاہور سے بیزار تھے۔ کہتے تھے کہ "یہاں آکر دنیا سے کٹ گیا ہوں۔ لندن کے اخبار یہاں ہفتہ بھر بعد پہنچتے ہیں۔" وہ جب لیڈرز پروگرام میں امریکہ گئے تھے تو وہاں سے صرف ایک ریفریجریٹر اور ایک بدھ کی مورتی لائے تھے۔ کار انہوں نے بہت بعد میں خریدی تھی۔ اور پھر کار ہونے کے باوجود وہ ہفتے میں ایک دن بس میں سفر لازماً کرتے تھے تاکہ عوام سے ان کا رابطہ قائم رہے اور وہ طبقاتی علیحدگی پسندی کا شکار نہ ہو جائیں۔ وہ کھدر کا کرتا پہنتے تھے اور شہر کے اونچے ہوٹل شیزان میں بیٹھتے تھے۔ اور اپنے انگریزی پھولوں کی کیاری میں انہوں نے ایک کی قلم بھی لگائی تھی تاکہ دیسی کلچر فراموش نہ ہو جائے۔ صادقہ زین العابدین نے ان پھولوں کے بارے میں یہ سوال اٹھایا کہ "ان میں مہک تو ہے ہی نہیں۔" مگر جب سید حسن نے اسے یہ سمجھایا کہ "خوشبو اور مہک کا مطالبہ خام جمالیاتی مذاق کا مطالبہ ہے" تو وہ اپنے اعتراض پر خود ہی شرمندہ ہو گئی۔ پھر اس نے خوشبو دار دیسی پھولوں کو بھول کر سید حسن کے انگریزی پھولوں کو اس طرح پسند کرنا شروع کیا جیسے نئے نئے تہذیب یافتہ ہلکے پھلکے گانوں سے ترکِ تعلق کر کے کلاسیکی موسیقی سے عشق کرتے ہیں۔

صادقہ زین العابدین نے آدرے ہیپرن کی طرز پر اپنی زلفیں ترشوائی تھیں۔ عاشورہ کے دنوں وہ ان زلفوں میں کنگھی نہیں کرتی تھی اور کالا لباس پہنتی تھی۔ کالے لباس پر دوستوں نے انگلیاں اٹھائیں تو سید حسن رقیق القلب ہو گئے اور بولے: "محرم میں کالی قمیض پہننا مذہب نہیں ہے کلچر ہے۔"

اس پر سب چپ ہو گئے کیونکہ کلچر کے تو سب ہی قایل تھے۔ اور جب سید حسن نے اپنے گھر مجلس منعقد کی تو اس میں سب شریک ہوئے۔ صادقہ زین العابدین نے اس روز نہ بالوں میں تیل ڈالا تھا نہ کنگھی کی تھی اور ململی سیاہ قمیض کے پہلو والے پٹیچ بٹن سب کھلے ہوئے تھے۔ سید حسن کا دل اس دن یوں بھی گداز ہو جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ اور بھی بے چین رہے۔ اور اس نے سید حسن کے گھر پہنچ کر مہاتما بدھ کی مورتی پر اپنا رومال ڈال دیا اور دیوار میں آویزاں نیوڈ

کو اٹل کر دیا۔ پھر اس نے نجم الحسن کی بنائی ہوئی تجریدی تصویر ذوالجناح کو کارنس پر سجایا اور بڑی عقیدت کے ساتھ اگر بتیاں سلگائیں۔ سید حسن نے اپنی انگریزی پھولوں کی کیاری سے پھول لاکر ہار گوندھا اور نجم الحسن کی پینٹنگ پر ڈال دیا۔ پھر صادقہ زین العابدین کا بازو بین کر سوز پڑھا۔ سید حسن سوز پڑھ کر رو دیئے اور بولے کہ "ذوالجناح اور علم صلیب سے بڑے سمبل ہیں۔ پتا نہیں ہمارے پینٹر ان سے کیوں متاثر نہیں ہوئے؟" اشرف نے، کہ پچھلے ایک سال سے مستقل مسلمانوں کی منھ کا متلاشی تھا۔ یہ سنا اور متاثر ہوا اور قمیض اتار کر ماتم کیا۔ اس نے اعلان کیا تھا، کہ اگلے برس وہ بھی کالی قمیض پہنے گا۔ مگر چونکہ چند ہی ماہ بعد مارکیٹ میں ایک نئی کتاب آگئی اور اشرف کو یونگ سے چند در چند اختلافات ہو گئے اس لئے یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا۔ مگر محسن کے طریقے میں ایک اعتدال تھا۔ خدا کے وجود سے انکار تو اس نے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن لیتے ہی کر دیا تھا، اور اب تو خیر وہ ایم۔ اے۔ تھا۔ مگر اسلام کا وہ ایک سوشل موومنٹ کے طور پر ہمیشہ قایل رہا۔ سماجی اصلاحات کے اس پروگرام کو سوسائٹی کے دشمنوں سے بچانے کے لیے امام حسین نے جو قربانی دی اسے وہ مانتا تھا۔ البتہ محرم میں وہ ریفارم کا طالب تھا۔ تاہم سید حسن کے گھر کی مجلس میں بیٹھنے اور رو لینے میں اسے مضائقہ نظر نہیں آیا۔

ساجدہ نیاز کو محسن کے گریہ پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ اس نے بے تعلقی کے انداز میں کہا "کوئی رافضی ہو یا مرزائی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں تو مہاتما بدھ کی پیرو ہوں۔" یہ سنجیدہ قسم کی بے تعلقی اس کا مخصوص وصف تھی اور نازک سے نازک موقعے پر برقرار رہتی تھی۔ جب اس نے لیڈی چیٹرلیز لوو، کا سالم اڈیشن ختم کیا اور کرداروں کے رویے پر محسن سے تبادلہ خیال شروع کیا تو محسن کو ایک مرتبہ پھر زمین ہموار نظر آئی اور اس نے بحث کی گرما گرمی میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ساجدہ نیاز بولتے بولتے رکی۔ مکمل بے تعلقی سے اپنے ہاتھ کو محسن کے ہاتھوں میں دیکھا اور سنجیدگی سے بولی: "آپ کو یہ معلوم ہے کہ میں ایک قدامت پسند لڑکی ہوں؟" اس فقرے پر محسن کے ہاتھوں کی گرفت آپ ہی آپ ڈھیلی پڑ گئی اور ساجدہ نیاز

نے نہایت متانت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

ساجدہ نیاز محسن ہی کو نہیں اپنی بہن زاہدہ کو بھی غیر سنجیدہ جانتی تھی۔ اور زاہدہ واقعی غیر سنجیدہ تھی۔ اس کے کمرے میں بغیر دستک دیے گھس آتی اور اگر وہ سوتی ہوتی تو لحاف اٹھا کر الگ پھینک دیتی۔ اسی ہڑ ونگے پن میں تو وہ اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ گئی تھی۔ گھر کے کمروں سے لے کر عقب کے باغیچے تک قلانچیں لگاتی پھرتی تھی۔ جب افو گرمیوں کی چھٹیاں خالہ کے گھر گزارنے آیا تو ساجدہ نیاز نے تو اسے مطلق منہ نہیں لگایا۔ منہ کیا لگاتی، فرسٹ ایر کا تو وہ طالب علم تھا۔ مگر زاہدہ ایک دن کے اندر اندر اس سے گھل مل گئی۔ خیر پہلا دن تو کچی امیاں توڑنے ہی میں گزر گیا اور دونوں اس میں ایسے غرق ہوئے کہ انھیں ایک دوسرے کے وجود کا احساس تک نہیں ہوا۔ دوسرے دن جب انھیں ایک دوسرے کے وجود کا احساس ہوا تو وہ بھی عجب طرح سے۔ نہ انھوں نے رومانٹک باتیں کی تھیں، نہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما تھا، نہ آیئڈیلزم بگھاری تھی۔ ہوا یوں کہ جب وہ امیاں توڑ کر درخت سے زاہدہ کا سہارا لیے کر اتر رہا تھا تو اس کا سانس تیز اور گرم ہو گیا۔ اور گرمی اس وقت بہت تھی۔ اس تپتی دوپہری میں درختوں کے درمیان گھومتے گھومتے ان کے جسم پھنکنے لگے تھے۔ زاہدہ کے گورے گال گرم ہو کر سرخ ہو گئے تھے اور قمیص پسینے میں بھیگ کر بے بنیائن والی بھری پشت پر چپکنے لگی تھی۔ اور قمیص کے شانوں کے سہارے درخت سے نیچے اترتے اترتے افو کا سانس تیز ہو گیا اور بانہیں اس بھیگی کمر کے گرد لپٹتی چلی گئیں۔ اور جیسے گرم دوپہروں میں دانہ چگتے چگتے ایکا ایکی مرغا بجھونے لگتا ہے اور مرغی بیٹھنے لگتی ہے اور پھر دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں بس اسی طرح کھڑی دوپہر میں ایک اندھیرے نے انہیں آناً فاناً آلیا۔

جب اندھیرا چھٹ گیا تو انہوں نے اپنے آپ کو بہت ہلکا اور بہت پاکیزہ محسوس کیا۔ بس انھیں یوں لگا کہ کچی امیاں کھاتے کھاتے انہوں نے کوئی میٹھا رس بھرا آم چوس لیا ہے۔

مگر ساجدہ نیاز کو آم اور امیوں سے نفور تھا۔ ریفریجریٹر میں لگے ہوئے سردے کو نکال

کر چلتی کی سفید پلیٹ میں وہ بڑے سلیقے سے اس کی دو پھانکیں تراشتی، پھانکوں کو قتلہ قتلہ کرتی اور ایک متانت آمیز بے تعلقی کے ساتھ انہیں کانٹے سے تناول کرتی۔ مذہبی عقیدے سے لے کر سردے کی قاش تک اس نے یہ متانت آمیز بے تعلقی برقرار رکھی تھی۔ مگر محسن اور اس کے درمیان پھر بھی لڑائی ہو کر رہی۔ ہوا یوں کہ ایلویس پریسلے کا مسئلہ درمیان میں آگیا۔ محسن اسے VULGER کہتا تھا۔ بات بڑھ گئی اور ساجدہ نیاز نے اعلان کیا کہ "میرے اور آپ کے درمیان نظریات کا فرق پیدا ہو چکا ہے۔"

محسن نے جب یہ تشویشناک اطلاع اشرف کو دی تو اُس نے اسے جھڑک دیا: "فضول باتیں مت کرو۔ عورت اور مرد کے درمیان نظریات کا فرق کبھی پیدا نہیں ہوتا۔"

"مگر وہ ہو گیا ہے۔"

"ہو گیا ہے تو یا تم مرد نہیں ہو یا وہ عورت نہیں ہے۔"

اشرف کا نظریہ یہ تھا کہ نظریات آدمی کی حماقت ہیں۔ عورت کے نظریات نہیں ہوتے احساسات ہوتے ہیں۔ مگر ساجدہ نیاز کو یہ احساس تھا کہ وہ نظریات رکھتی ہے۔ اس کے اسی احساس نے محسن کے لیے جدائی کی اذیت کا سامان کیا۔ محرومی کے عالم میں محسن نے کیا کچھ نہیں سوچا: کہ وہ خودکشی کر لے، کہ وہ کپڑے پھاڑ کر جنگل میں نکل جائے اور سادھو بن جائے۔

سید حسن نے ان میں سے کسی تجویز پر صاد نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب اظہار ذات کے روایتی سانچے ہیں۔ "اور عشق" انہوں نے اپنے دانشورانہ لہجے میں کہا "کوئی تخریبی طاقت نہیں ہے۔" "اور جو عاشق صحراؤں میں نکل گئے اور تیشے سے سر پھاڑ کر مر گئے ان کے متعلق کیا ارشاد ہے؟" محسن نے جل کر سوال کیا۔

"وہ عشق نہیں تھا، مریضانہ داخلیت پسندی تھی۔" سید حسن نے وثوق سے کہا۔

محسن، کہ عقلیت پسند تھا، اس استدلال سے قائل ہو گیا۔ اس نے جینے کا حوصلہ پیدا کیا اور ساجدہ نیاز کو ٹیلی فون کر ڈالا۔ ساجدہ نیاز اس دن روزے سے تھی۔ سحری کھانے کے فوراً بعد

وہ ستار لے کر بیٹھ گئی تھی۔ جب اذان ہوئی تو اس نے وضو کر کے فریضۂ سحری ادا کیا۔ پھر تلاوت کرنے بیٹھ گئی۔ صبح ہوئے پہ اس نے قرآن جزدان میں بند کیا، ریڈیو آن کیا اور جالندھر سے بھجن سننے لگی۔ اتنے میں محسن کا ٹیلی فون آگیا۔ اس نے نہایت بے تعلقی سے محسن کی بات سنی اور پھر بڑی شائستگی سے جواب دیا:

"محسن صاحب، معاف کیجئے، میرے اور آپ کے درمیان نظریات کا فرق ہے۔ میں اپنے آپ کو آپ سے بہت دور محسوس کرتی ہوں اس لیے آنے سے معذور رہوں گی۔ شکریہ۔" اور وہ ٹیلی فون بند کر کے جب برآمدے میں آئی تو سامنے باغیچے میں زاہدہ دوپٹے سے بے نیاز، شلوار کے پائنچے چڑھائے امرود کے پیڑ پر چڑھ رہی تھی۔ افو نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑی ہوئی تھیں اور اُسے اُوپر چڑھنے میں سہارا دے رہا تھا۔ زاہدہ نے ایک کچا امرود توڑ کر آدھا کھایا اور آدھا پلٹ کر افو کے سر پہ کھینچ مارا۔ افو نے پچکچا کر اس کی ننگی پنڈلی میں کاٹ لیا۔ روزہ دار ساجدہ نیاز کو اس بیہودگی پر سخت غصہ آیا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بے اطمینان سی بیٹھی رہی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ روزے کا لمبا دن کیسے کاٹا جائے۔ آخر اس نے پھر ستار اُٹھا لیا اور روزے کے وقت تک مشق جاری رکھنے کی ٹھانی۔

محسن نے جینے کا حوصلہ اس ٹیلی فون کے بعد بھی نہیں ہارا۔ اس نے اب اپنے عشق کو ایک تربیتی کورس تصور کر لیا تھا اور اپنے ہجر کو ایک تخلیقی تجربہ سمجھ کر مطمئن تھا۔ مگر بار بار اس پہ دورہ سا پڑتا۔ ساجدہ اسے بے طرح یاد آتی اور پھر اسے یوں لگتا کہ اس کا عشق تعمیری طاقت بننے کی بجائے مائل بہ تخریب ہے اور وہ بیمار قسم کی داخلیت پسندی کا شکار ہو رہا ہے۔

اشرف نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور سیدھا سوال کیا۔

"تم نے اسے ....."

مگر محسن اس سوال پہ اتنا سٹپٹایا کہ اشرف کا فقرہ پورا نہیں ہونے دیا اور جواب دیا:

"نہیں۔ نہیں۔"

"کیوں؟"

"بس نہیں۔"

"احمق۔" اشرف نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا، "وہ مہاتما بدھ کی پیرو ہے، معاف کردینی مہاتما بدھ کے پیرو ہونے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

محسن نے دکھ بھری نظروں سے اسے دیکھا اور چپ رہا۔ پھر وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے ٹھنڈا سانس بھرا اور بولا: "خیر اب تو وہ گئی۔"

"گئی؟ کون گئی؟ تو نرا گاؤدی ہے۔ دو چیزیں آکر نہیں جایا کرتیں: بڑھاپا اور عورت۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ پھر آئے گی۔"

محسن نے مایوسانہ کاندھے جھکائے اور چپ ہو گیا۔

"میں صحیح کہتا ہوں۔" اشرف نے پھر کہا، "تاریخ اور عورت، یہ دو طاقتیں ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہیں۔ جو عورت آگئی ہے وہ نہیں جائے گی۔ مگر آنے والی ایک مرتبہ ضرور جاتی ہے اور سوچنے کی مہلت دیتی ہے اور جانے والی ایک مرتبہ اور پلٹ کر پلٹتی ہے، طے بات ہے کہ وہ پھر آئے گی۔

اور اس کے بعد اشرف روز ملنے پر اس سے پہلا سوال یہ کرتا: "آئی؟"

"نہیں"

"انتظار کرو، آئے گی۔"

اور ایک روز محسن نے اطلاع دی مگر مری ہوئی آواز میں: "یار وہ آئی تھی۔"

"دیکھا، میں نہ کہتا تھا۔ مان لو اب ہمیں استاد۔"

مگر محسن نے اشرف کے اس افتخار کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ رک کر بولا: "یہ سوئٹر جو میں پہنے ہوئے ہوں، یہ مجھے ساجدہ نے بر بنائے دیا تھا۔"

"پھر؟" اشرف نے بھونچکا ہو کر پوچھا۔

"پھر یہ کہ ساجدہ آئی۔ اس نے کہا: 'ہم آپ نظریاتی طور پر الگ ہو چکے ہیں، مہربانی فرما کر ہمارا سوئٹر ہمیں واپس دے دیجئے۔'"

"اچھا؟" اشرف حیران رہ گیا، "پھر؟"

محسن، کہ عشق سے زندہ رہنے کے آداب سیکھ رہا تھا، بولا: "پھر کیا؟ معاملہ تو ختم ہو گیا۔ مگر تم جانتے ہو کہ یہ دسمبر کا مہینہ ہے۔ جنوری کا مہینہ پورا پڑا ہے۔ میں نے صاف کہہ دیا۔ کہ سردیوں میں یہ سوئٹر واپس کرنے سے معذور رہوں گا۔"

"معقول بات ہے۔ کیا کہا اس نے؟"

"کیا کہتی؟ وہ مہاتما بدھ کی پیرو ہے، پھر اس نے معاف کر دیا۔ کہہ گئی ہے: میں آپ کے مسئلے کو سمجھتی ہوں۔ بہرحال مارچ کے پہلے ہفتے میں سوئٹر میرے پاس پہنچ جانا چاہیئے۔"

محسن یہ کہہ کر چپ ہو گیا مگر پھر بھی بے اطمینان سا رہا۔ اشرف نے اسے غور سے دیکھا اور کہا: "اب کیا تکلیف ہے تمہیں؟"

"یار میں سوچتا ہوں کہ تم سچ ہی کہتے تھے۔" محسن رکا اور پھر بولا، "میں سوچتا ہوں خطا مجھی سے ہوئی، وہ تو مہاتما بدھ کی پیرو ہے، معاف بہرحال کر دیتی۔"



# ۳۱ مارچ

اس محبت کی مدت دس مہینے تیس دن ہے۔ یعنی یکم مئی ۵۸ء کو اس کا آغاز ہوا اور ۳۰ مارچ ۵۹ء کو اس کا انجام ہوا۔ اصل میں اس کا انجام مارچ کی آخری تاریخ کو ہونا تھا۔ اس صورت میں حساب سیدھا ہوتا اور محبت کی مدت گیارہ مہینے ہوتی۔ گھپلا اس وجہ سے پیدا ہوا کہ حسن مارچ کو تیس دن کا مہینہ سمجھے ہوئے تھا۔ ۳۱ مارچ کی صبح کا اخبار دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ مہینہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ لیکن اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ کل ڈائری میں لکھ چکا تھا کہ محبت ختم ہو گئی۔

مگر حسن نے محبت کی میعاد چھ ماہ رکھی تھی۔ چار مہینے تیس دن زائد المیعاد دن ہیں حسن نے ششماہی محبت کا منصوبہ سوچ سمجھ کر بنایا تھا اور اس کا پابند رہنے کی حتی الامکان کوشش کی تھی۔ پھر بھی اسے چھ ماہ کے ختم پر توسیع کرنی پڑ گئی۔ یہ توسیع دو مرتبہ کی گئی۔ دونوں مرتبہ دو دو مہینے کی توسیع دی گئی۔

حسن کہ دانشور تھا یہ بات بہت دنوں سے جانتا تھا کہ محبت کے بغیر آدمی کی تکمیل

نہیں ہوتی۔

مگر خود اپنی تکمیل کرنے کی وہ کوئی نیت نہیں رکھتا تھا۔ اپنی تکمیل کی نیت اسے زبیدہ کے یہاں بھی نظر نہیں آئی۔ اور زبیدہ پہ اسے ایک معصوم اور پارسا لڑکی کا گمان تھا اس لیے اس کے متعلق اس نے یہ طے کیا کہ ایسی لڑکی سے شادی کی جا سکتی ہے، محبت نہیں کی جا سکتی۔ اور چونکہ مجھے شادی کرنی نہیں ہے اور چونکہ وہ بھی مجھ سے شادی نہیں کر سکتی اس لیے مجھے اس خیال سے باز رہنا چاہیئے۔ یہ بات اس نے بہ قائمی ہوش و حواس سوچی اور چپ ہو گیا۔ مگر پھر اس کے ذہن میں یہ سوال آیا کہ آخر یہ بات اس کے ذہن میں آئی کیوں۔ اب تک تو اس لڑکی کے متعلق کوئی خیال اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ آخر اس نے نفسیات پڑھی تھی اور وہ اس بات سے بیخبر نہیں تھا کہ ذہن میں کسی خیال کا آنا خود ایک خطرے کی گھنٹی ہے۔ تو اس نے احتیاطاً ڈائری میں تاریخ نوٹ کر لی کہ کس دن ایسا خیال پہلی مرتبہ اس کے ذہن میں آیا یہ سوچ کر کہ مبادا کوئی قصہ شروع ہو جائے۔ اور قصے کی انتہا نہ معلوم ہوا بتدا تو معلوم ہونی چاہیئے۔ یہ ۲۷ فروری ۵۸ء کی بات ہے۔

۲۷ فروری ۵۸ء کے بعد سے اس نے اپنی تھوڑی سی نگرانی شروع کر دی۔ بات یہ ہے کہ وہ محبت کے الجھیڑے میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا تو جب زبیدہ کا خط آتا تو وہ اپنے آپ سے دور کھڑے ہو کر اپنے آپ پہ اس خط کے اثرات کا مشاہدہ کرتا۔ اور جب زبیدہ کا فون آتا تو ایک حسن فون پہ باتیں کرتا اور دوسرا حسن کونے میں کھڑا ہو کر فون پہ باتیں کرنے والے حسن کو تکتا رہتا۔ مگر پھر دوسرا حسن خود ہی رفتہ رفتہ ڈھیلا پڑ گیا۔

پھر ایک روز حسن نے کسی قدر تردد کے ساتھ منصور سے کہا کہ "یار اس لڑکی کا معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔"

"اچھا" منصور نے بہت اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں یار،" حسن نے پریشان ہو کر کہا "خط بہت لکھتی ہے۔"

"اور تم؟"

"میں بھی لکھتا ہوں۔"

"تو محبت ہو گئی ہے؟"

محبت کے لفظ پر حسن بہت بھڑکا۔ اور اس کے بعد اس نے اچھے خاصے دنوں تک اس مسئلہ پر مقصود سے کوئی بات نہیں کی۔ مگر پھر عزیز سے باتیں کرتے کرتے یہ لفظ خود ہی اس کے منہ پر آ گیا "یار مجھے اندیشہ ہے کہ مجھے اس سے محبت تو نہیں ہو گئی۔"

"محبت؟" عزیز نے تحقیر آمیز لہجہ میں کہا "وہ کیا ہوتی ہے؟"

"پتہ نہیں یار۔" حسن تھوڑا اٹپٹا گیا "مگر وہ خط بہت لکھتی ہے اور میں بھی خط بہت لکھتا ہوں۔"

"تو سیدھی بات کہو کہ ایک لڑکی پھنس رہی ہے مگر ویسے وہ خط کیا لکھتی ہے۔"

حسن نے وضاحتی بلکہ معذرتی انداز میں کہا "نہیں یار ایسا معاملہ نہیں۔ ہماری خط و کتابت انٹلکچوئل مسائل پر ہوتی ہے۔"

"انٹلکچوئل مسائل پر؟" عزیز پھر بھڑک گیا "انٹلکچوئل مسائل پر خط و کتابت لڑکی سے۔"

حسن نے پھر معذرت کی "یار وہ لڑکی ویسی نہیں۔"

"کیسی نہیں" عزیز نے غصہ سے کہا۔

اور حسن نے ویسے سے لہجہ میں کہا "وہ بہت سنجیدہ لڑکی ہے یار۔"

عزیز نے اپنے غصہ پر قابو پایا اور پھر کہا کہ "دیکھو حسن ہر لڑکی سنجیدہ ہوتی ہے۔ مگر کوئی لڑکی سنجیدہ نہیں رہنا چاہتی اور ہر لڑکی جو کالج میں پڑھتی ہے۔ انٹلکچوئل خط لکھے گی۔ مگر کوئی لڑکی یہ نہیں پسند کرے گی کہ اس کے انٹلکچوئل خط کا جواب انٹلکچوئل خط سے دیا جائے۔"

حسن نے یہ بات کسی قدر تنگ کے ساتھ قبول کی۔ مقصود نے جب یہ سنا تو افسوس بھرے لہجہ میں کہا کہ "خرابی یہ ہے کہ بیچارے عزیز کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ اس کی ایک خاص ذہنی

سطح ہے اس سے بلند ہو کر وہ نہیں سوچ سکتا" چپ ہوا۔ پھر بولا ذہین لڑکیوں سے پالا پڑا وہ بھی ایسی ویسی تھیں۔ کسی شریف تعلیم یافتہ لڑکی سے اس کا ربط ہوا ہی نہیں۔ ایسی لڑکی ہمیشہ یہ دیکھتی ہے کہ کیا آپ اس سے ذہنی طور پر برتر ہیں۔ ذہنی لحاظ سے اپنے سے کمتر کو وہ قبول نہیں کر سکتی۔"

اصل میں عورت کے بارے میں مقصود کے اپنے نظریات تھے اور عزیز کی اپنی ایک مخصوص بصیرت تھی۔ حسن دو بصیرتوں کے درمیان لڑھک رہا تھا۔ مگر موت اور عورت، ان دو کے سامنے آدمی اکیلا ہوتا ہے۔ اپنی ہی بصیرت ہو تو کام آتی ہے حسن بصیرت سے محروم تھا۔ اس نے فراخدلی سے اپنی اس کوتاہی کا اعتراف کیا۔ پھر کچھ درس مقصود سے لیا اور کچھ زانوئے ادب عزیز کے سامنے تہہ کیا۔ اور عزیز یہ کہتا تھا کہ عورت سفنکس ہے۔ جو عورت تمہارے پاس آتی ہے وہ ایک سوال بن کر آتی ہے۔ اگر تم نے اس کے سوال کو سمجھ لیا تو تم نے اسے توڑ دیا نہیں سمجھا تو وہ تمہیں توڑ دے گی۔ مقصود عزیز کی ایسی سب باتوں کو سن کر بس ایک بات کہتا تھا کہ پرانے لوگوں نے عورت اور مرد کے رشتہ کو صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں۔ عورت اور مرد ایک دوسرے کے حریف اور مقابل نہیں ہیں۔ اور محبت کوئی جنگ نہیں ہے۔

حسن بیک وقت مقصود اور عزیز دونوں کا قائل تھا۔ تو کبھی وہ زبیدہ سے یوں رجوع کرتا جیسے وہ سپاہی ہے اور اسے اس قلعہ کو توڑنا ہے اور یہ مہم سر کرنی ہے۔ اور کبھی یوں رجوع کرتا جیسے وہ بھگت ہے اور مندر میں داخل ہو رہا ہے۔

زبیدہ کی روش یکساں تھی۔ اس نے شروع ہی میں لکھ دیا تھا کہ میں اپنی تنہائی کے جہنم میں اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرتی ہوں۔ مگر اس معذرت نے اور قہر ڈھایا۔ یہ معذرت حسن کے دانشورانہ مزاج میں کھب گئی۔ اس فقرے نے اس پر وہی اثر کیا جو نوخیز ان پڑھ لڑکوں پر فلمی مکالمہ اثر کرتا ہے۔ اس نے اس خط کا جواب بہت سوچ سمجھ کر دیا اور لکھا کہ میری ذات میرا جہنم ہے۔ میں اس سے نجات چاہتا ہوں۔

اس دانشورانہ رومانی لہجہ میں بہت سے خط حسن نے لکھے اور بہت سے جواب زبیدہ نے دیئے۔ مگر پھر حسن تھک گیا اور اس نے سوچا کہ میں نے محبت کو ایک علمی مسئلہ بنا دیا ہے۔ حالانکہ وہ ایک سیدھا سچا انسانی تجربہ ہے۔ اس احساس کے تحت اس نے اپنے صبا رفتار قلم کو تھوڑی لگام دی۔ خیر لگام تو اس نے دے لی مگر یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اب وہ کیا کرے۔ اسی الجھن میں اس نے ایک روز مقصود سے کہا "یار میں تھوڑا سا بیوقوف نہیں ہوں"۔

مقصود نے اس کی بات سنی اور جواب دیا "ہر محبت کرنے والا بیوقوف ہوتا ہے۔ چالاک بن کر تو محبت نہیں کی جا سکتی۔

کہیں اسی وقت عزیز بھی آن دھمکا۔ اس نے خود اس نظریئے کی تردید کی "یہ کون کہتا ہے۔ آدمی جب تک مکار نہ ہو، محبت نہیں کر سکتا"۔

مگر عزیز نظریاتی بحثوں کا زیادہ قائل نہیں تھا۔ مقصود نے اس مسئلہ پہ بحث کی کوشش کی کہ آیا عشق حماقت کا نام ہے یا مکاری کا۔ لیکن عزیز نے اس کی ساری بحث کاٹ کر حسن سے سیدھا سوال کیا "سیدھی بات بتاؤ۔ چکر کیا ہے"۔

حسن نے منہ لٹکا کر جواب دیا "یار خط و کتابت بہت لمبی ہو گئی"۔

"اسے مختصر کرو۔"

"مگر کیسے کروں"۔

"دیکھو دنیا میں دو قسم کی لڑکیاں پائی جاتی ہیں" عزیز رکا اور بولا "میرا مطلب ہے کہ خط لکھنے والی لڑکیوں میں دو قسم کی لڑکیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک وہ جو اپنے خطوں میں فلمی مکالموں سے استفادہ کرتی ہیں اور ایک وہ جو انٹلکچوئل قسم کے ناولوں سے استفادہ کرتی ہیں۔ مگر لفظ خواہ وہ فلمی ڈائیلاگ ہوں خواہ وہ سارتر سے ماخوذ ہو عمل کا بدل نہیں ہے اور پھر فلمی مکالموں سے استفادے کا ایک جواز ہے۔ مگر انٹلکچوئل ناولوں سے استفادہ کر کے خط لکھنا متبذل حرکت ہے خواہ یہ حرکت تم کرو یا وہ کرے۔ تو لفظوں کے اس ابتذال کو ختم کرو"۔

"مشکل ہے" اس نے اک بیچارگی کے احساس کے ساتھ کہا۔

"مشکل ہے تو پھر اس قصہ پہ خاک ڈالو اور اس لڑکی پہ لعنت بھیجو۔ ورنہ تم مارے جاؤ گے۔ پوچھو کیوں؟"

"کیوں؟"

"میری جان وہ یوں کہ محبت کوئی دائمی چیز نہیں ہے ہر جذباتی صورت حال کی ایک مدت ہوتی ہے اور اس کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ تقاضے اس مدت میں پورے ہونے چاہئیں۔ اگر مرد ان تقاضوں سے کترائے گا تو عورت اس پہ لعنت بھیجے گی اور متنفر ہو جائے گی۔ اگر عورت دامن بچائے گی تو مرد اسے ٹھوکر مارے گا اور الگ ہو جائے گا۔ تو قبل اس کے کہ وہ تم پہ لعنت بھیجے اور تم سے متنفر ہو تم اسے ٹھوکر مارو اور الگ ہو جاؤ۔"

مقصود نے عزیز کو حقارت کی نظروں سے دیکھا اور پھر وہ کتاب جو وہ ابھی ابھی خرید کر لایا تھا کھول کر یوں پڑھنی شروع کر دی جیسے وہ عزیز کی باتیں مطلق نہیں سن رہا۔

حسن چونکہ رومانٹک آدمی نہیں تھا۔ اسلئے اس نے ایسے خیالات کا ہمیشہ احترام کیا تھا۔ مگر اس وقت وہ کسی قدر مذبذب تھا۔ عزیز نے پھر کہا "ٹھوکر مارو جی" اور یہ کہتے کہتے، اس نے ایک اور حکمت اگل ڈالی "عورت کو ٹھوکر مارو۔ عورت تمہارے قدموں پہ گرے گی۔ عورت کو سجدہ کرو، عورت تمہارے سر پہ سوار ہو جائے گی۔ عورت کی عزت کرو گے تو عورت تم سے نفرت کرے گی۔ عورت کو حقیر جانو۔ وہ تمہیں سر چڑھائے گی۔

عزیز چلا گیا تو مقصود نے کتاب بند کی اور اطمینان کا سانس لیا۔ "سخت ونگر آدمی ہے۔ پلچر باتیں کرتا ہے۔" اس دیباچہ کے بعد اس نے ٹکڑا لگایا "عورت سے ملنے کے لیے اپنے آپ کو توڑنا پڑتا ہے۔ محبت انا کے اعلان کا نام تو نہیں ہے۔ حسن تمہارے ساتھ خرابی یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو توڑ نہیں سکتے۔ اپنے آپ کو اپنے جذبے کے سپرد نہیں کر سکتے۔ مگر محبت تو سپردگی چاہتی ہے۔ اور عورت کو تم اس کی عزت کر کے ہی جیت سکتے ہو۔"

حسن نے کچھ باتیں عزیز کی سنیں، کچھ باتیں مقصود کی سنیں۔ کچھ باتیں اس نے کتابوں میں پڑھ رکھی تھیں۔ اور کتابوں میں باتیں پڑھنے کے بعد اس نے اپنے متعلق طے کیا تھا کہ وہ رومانٹک آدمی نہیں ہے۔ مگر ان دنوں مختلف باتیں اور مختلف نظریات و تصورات اس کے اندر کچھ گڈ مڈ ہو گئے تھے۔ اور اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس نظریئے کا آدمی ہے۔ مگر آخر وہ دانشور تھا۔ اس نے اس نظریاتی فساد کو رفتہ رفتہ ایک واضح نقطۂ نظر میں ڈھال لیا اور مقصود اور عزیز کو آکر اطلاع دی "یار میں نے اس سے کہہ دیا کہ مجھ سے شادی کر لو۔"

"شادی؟" عزیز نے نہایت تحقیر کے ساتھ حسن کو دیکھا "شادی اور محبت کا آپس میں کیا تعلق ہے؟"

مقصود نے اطمینان کے لہجہ میں کہا "حسن تم نے ٹھیک کیا۔ کیا جواب دیا اس نے؟"

"یار خفا ہو گئی وہ۔"

"اصولاً اسے خفا ہونا چاہیئے تھا۔" اب عزیز نے اطمینان کا لہجہ اختیار کیا۔

مقصود نے عزیز کی بات سنی ان سنی کی اور افسوس کے لہجہ میں کہا "یار اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تم سے نفرت کر رہی تھی۔"

عزیز نے کہا "نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فلرٹ نہیں کر رہی تھی سچی محبت کرتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" مقصود نے غصہ سے پوچھا۔

"مطلب یہ ہے کہ جب لڑکی فلرٹ کرتی ہے تو شادی کی بات پر خوش ہوتی ہے جب محبت کرتی ہے تو شادی کی بات پر خفا ہوتی ہے۔ اور اگر محبت میں لڑکی شادی پر رضامند ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ محبت نہیں کر رہی تھی، شادی کے لیے پھانس رہی تھی انکار کر دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ واقعی محبت کرتی ہے۔ شادی اور محبت زندگی کی دو الگ الگ مدیں ہیں۔ ایک عقل کا روبار ہے۔ دوسری چیز تخلیقی سرگرمی ہے۔"

بہر حال اب حسن نے ایک واضح موقف اختیار کرلیا اور عزیز اور مقصود کے نظریاتی اختلافات اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتے تھے۔ کہنے لگا کہ "یار بات یہ ہے کہ میں رومانٹک آدمی نہیں ہوں۔ اور ہر تجربہ کی اک عمر ہوتی ہے۔ میرے تجربہ کی عمر پوری ہو چکی۔ ویسے میں عجلت پسند نہیں ہوں۔ میں نے ایک ہفتے کا مارجن رکھا ہے۔"

مقصود نے تھوڑا بیزار ہو کر سوال کیا "اس سے تمہاری کیا مراد ہے"؟

"میری مراد یہ ہے کہ آج مارچ کی ۲۳ ہے یہ مہینہ بہر حال اپنے تجربے کے لئے وقف ہے۔ اس میں کچھ ہوا اور ظاہر ہے کہ کچھ نہیں ہوگا تو اس مہینہ کے ختم پر میں باقاعدہ اور قطعی طور پر اس تجربے کے ختم کا اعلان کردونگا۔"

عزیز نے ٹکڑا لگایا "صحیح فیصلہ ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے عہد میں محبت کے تجربے کی عمر اتنی طویل نہیں ہوسکتی جتنی مجنوں اور فرہاد کے عہد میں تھی۔ ان کے لیے عشق ہول ٹائم جاب تھا۔ ہم اسے پارٹ ٹائم ہی کرسکتے ہیں اور اسے لمبا نہیں چلا سکتے۔

"مجھے بس ایک بات کی فکر ہے۔" حسن نے کہا۔

"کیا" عزیز نے سوال کیا۔

"یار میں نے اپنے خطوط میں بعض بہت کام کی باتیں لکھی ہیں۔ ان خطوط کی نقلیں میرے پاس محفوظ نہیں ہیں۔ اور اب مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ ادھر بھی یہ تحریریں محفوظ رہیں گی یا نہیں"۔

عزیز بولا "اس کا انحصار اس پر ہے کہ تم زندگی میں مشہور آدمی بنتے ہو یا نہیں بنتے اگر تم وہی رہے جو اب ہو تو یہ خط ضائع کر دیئے جائیں گے۔ اگر تم مشہور شخصیت بنے تو یا تو وہ تمہارے مرنے کے بعد ایڈٹ کرکے شایع کرے گی یا مرتے وقت اپنے سامان میں محفوظ چھوڑ جائے گی کہ محققین ان پہ کام کریں۔"

چونکہ حسن کو یہ یقین تھا کہ وہ اپنے عہد کی مشہور شخصیت بن کر مریگا اس لیے اسے یہ سن کر خاصی پریشانی ہوگئی "یار بات یہ ہے کہ میں نے بعض خطوں میں سخت گھپلا کیا

ہے۔ لارنس کا بیان سارتر سے منسوب کر دیا اور سارتر کا فقرہ کامیو کے منہ میں ڈال دیا۔ اور کہیں کہیں ایکسپریشن بھی بہت کمزور ہو گیا ہے بلکہ شاید کچھ محاورے کی بھی غلطیاں ہوئی ہیں۔" اپنے خطوں کی فکر حسن کو کئی دن پریشان کیے رہی۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور اس نے زبیدہ کو خط لکھا کہ فلاں فلاں خط میں حوالے کی غلطیاں ہیں۔ انہیں درست کر لیا جائے۔ اور جن فقروں کا ایکسپریشن کمزور ہے انہیں سمجھا جائے کہ میں نے نہیں لکھے ہیں۔ ایک خط میں ایک محاورہ غلط لکھا گیا ہے اسے درست کر لیا جائے۔

زبیدہ کے نام حسن کا یہ آخری خط تھا۔ یہ خط ۳۰ مارچ کی صبح کو لکھا گیا۔ اسی تاریخ کی رات کو حسن نے اپنی ڈائری کا ورق بھرتے ہوئے لکھا کہ آج مارچ کا آخری دن ہے مارچ کا بھی اور میری محبت کا بھی۔ اس تجربہ کی میعاد طے شدہ پروگرام کے مطابق آج ختم ہوئی ہے۔

## ۳۱ مارچ

تب اس نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا کہ ایسا ہی ہونا تھا۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس نے محبت کا تجربہ کر لیا اور اس میں سے کامیاب نکل آیا۔ کامیاب کے لفظ پر وہ تھوڑا ٹھٹکا۔ وہ ان لوگوں کو دھیان میں لایا جو تجربے میں غرق ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان لوگوں کو جو تجربے سے نکل آتے ہیں مگر ٹوٹ پھوٹ کر اس نے خالص علمی انداز میں اس مسئلہ پر غور کیا اور محبت میں کامیابی کے مروجہ تصور کو ایک تحقیر کے ساتھ رد کر کے اپنے تئیں کامیاب قرار دیا۔ اس نے اپنی ساری پسلیوں کو شمار کیا اور طے کیا کہ وہ آگ سے سالم نکلا ہے۔ اسے اپنی کئی ذلتوں کا خیال آیا مگر پھر اس نے غیر جذباتی غیر جانبدارانہ انداز میں طے کیا کہ ذلتیں تجربے کا حصہ ہیں اور آدمی بننے کے لئے ان سے گذرنا ضروری ہے وہ اب آدمی بن گیا ہے۔ اس نے ایک احساس برتری کے ساتھ فیصلہ کیا اور مطمئن ہو گیا۔

اب اسے فراغت تھی۔ فراغت کے ساتھ اسے بھولے ہوئے کام یاد آئے۔ اس نے ایک احساس ذمہ داری کے ساتھ ان سارے کاموں کی اہمیت کو محسوس کیا جو دس مہینے تیئس دن

غفلت کا شکار رہے تھے۔ اس نے پھر سے سرگرم ہونے کا تہیہ کیا اور تولیہ کاندھے پر ڈال لیک جھپک غسل خانے میں داخل ہو گیا۔

اس نے غسل غسل صحت کی طرح کیا۔ یا جیسے اس نے کوئی لمبا سفر کیا ہو۔ اور نہا دھو کر ساری تھکن ساری گرد اتار دینا چاہتا ہو۔ جیسے وہ غم و غصہ کی گرد میں اٹا ہوا تھا اور ذلتوں اور نجشوں نے اسے میلا کر دیا تھا۔ اور اس نے اشنان کیا اور وہ پوتر ہو گیا۔ غسل خانے سے وہ اپنے پھول سے بدن اور خوشبو روح کے ساتھ ایک نیا آدمی بن کر نکلا۔

کپڑے بدلتے بدلتے اس کی نظر اس نیلے خط پر جا پڑی جو کئی دن سے میز پہ کھلا پڑا تھا۔ اس خط کو اٹھا کر یوں پڑھا جیسے وہ کسی قدیم قلمی نسخہ کا مطالعہ کر رہا ہے۔ جس بے تعلقی کے ساتھ اس نے اسے اٹھایا تھا اسی بے تعلقی کے ساتھ اسے پھر میز پہ ڈال دیا۔ نہایت فضول قسم کا خط ہے میں نے کیا لکھا تھا۔ اس نے ایک تلخ سے احساس کے ساتھ پچھلے مختلف خطوط کا دھیان کیا۔ مگر پھر اسے یکایک خیال آیا کہ محبت کی میعاد تمام ہو چکی ہے۔ اس قسم کے کسی مسئلہ پر غور و فکر محض تضیع وقت ہو گا۔ اور آج پہلی ہے اور اسے بہت کام نبٹانے ہیں۔

عجلت میں کپڑے بدلے اور عجلت میں ناشتہ کیا کہ آج پہلی تھی اور اسے بہت کام نبٹانے تھے۔ مگر ناشتہ کرتے کرتے اس نے اخبار پر بھی ایک نظر ڈال لینے کی کوشش کی۔ ۳۱ مارچ اس نے اخبار کی تاریخ کو پھر غور سے دیکھا۔ تو گویا آج پہلی نہیں ہے یعنی مارچ کا مہینہ ختم نہیں ہوا ہے۔ یعنی اپنی میعاد تمام نہیں ہوئی ہے۔ مگر دوسرے سانس میں اس نے سوچا کہ جو لکھا گیا وہ لکھا گیا۔ کل میں اپنی ڈائری لکھ چکا ہوں۔ اور اب محبت کا کھڑاگ دوبارہ شروع نہیں کیا جا سکتا۔

جب وہ پوری طرح تیار ہو گیا اور گھر سے نکلنے کو تھا تو اسے خیال آیا کہ اسے واقعی آج ہی سے زندگی کا نیا پروگرام شروع کرنا ہے۔ مگر طے تو یہ ہوا تھا کہ مارچ کے ختم تک پرانا پروگرام چلے گا اور مارچ ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ تو کیا میں اس تجربے کی تجدید کروں

نہیں۔ وہ تجربہ تمام ہوچکا۔ پھر؟ اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ پھر وہ کیا کرے۔ پورا دن خالی پن کے ایک پہاڑ کی مثال اس کے سامنے کھڑا تھا۔

اسے مارچ۔ مارچ کی اکتیس اگر مارچ ہی کا حصہ ہے تو محبت کی میعاد کہاں سے ختم ہوگئی۔ اور اگر محبت کی میعاد ختم ہوچکی ہے تو اس دن کو کس خانے میں ڈالا جائے۔ گذرتے بسرتے دنوں میں کوئی کوئی دن عجب طرح اڑ کر کھڑا ہوجاتا ہے اور کسی خانے میں مقید ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور حسن یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ آج کا دن اسے کیسا گذارنا ہے۔ اس نے اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔ کتابوں پر نظر ڈالی۔ کتابوں کو اس نے کتنے دنوں سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ الٹ پلٹ کتابوں پر گرد کی تہہ جمی دیکھ کر اس نے سوچا کہ لگے ہاتھوں آج کتابوں کو درست کرکے رکھ دو۔

بہت دیر تک وہ کتابوں کو جھاڑتا رہا۔ جھاڑ پونچھ کر قرینہ سے ترتیب دیتا رہا۔ الماری میں کتابیں سجانے کے بعد اس نے میز پر بکھری کتابوں کو جمع کیا اور سلیقہ سے ترتیب دیا۔ ردی کاغذ کچھ چاک کیے کچھ توڑ مروڑ کر ٹوکری میں ڈالے۔ پھر اس نے وہ نیلا خط اٹھایا۔ چونکہ اس خط میں کوئی خاص بات لکھی ہوئی نہیں ہے اس لیے اسے محفوظ رکھنا بے سود ہوگا۔ مگر توڑتے مروڑتے ہوئے اس نے یونہی وہ خط کھولا اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ ایک دفعہ پڑھا۔ پھر دوسری دفعہ بہت آہستہ آہستہ پڑھا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جو کتابیں صاف کرتے کرتے بہت میلے ہوگئے تھے۔ اس نے ہاتھ رومال سے صاف کیے۔ پوروں سے خط کو پکڑا اور احتیاط سے تہہ کر کے لفافہ میں رکھا اور میز پہ رکھ دیا۔

ڈھیر ساری کتابیں صاف کرنے اور سجانے کے کام سے وہ تھک گیا۔ تھکن کے راستے ایک افسردگی کی کیفیت اس پر طاری ہوگئی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھیں بند ہوئیں تو تصوّر کا دریچہ کھل گیا۔ نیلے کاغذ پر سجے ہوئے سب لفظ جی اٹھے اور اس کے تصوّر میں منڈلانے لگے اس کا بے اختیار جی چاہا کہ وہ ان لفظوں کے جواب میں لفظ لکھے۔ اس کی انگلیوں میں وہی

بے چینی پیدا ہوئی جو پچھلے دنوں خط لکھنے سے پہلے پیدا ہوا کرتی تھی اور جب وہ قلم اٹھاتا تو سارے بدن کا جی انگلیوں میں اتر آتا، پوروں میں آکر ٹھہر جاتا اور لفظ قلم سے کاغذ پر یوں لکھا جاتا جیسے ہونٹ ہونٹوں پر بوسہ نقش کرتے ہیں مگر پھر اس نے فوراً جھرجھری لی قصہ پاک ہو چکا ہے۔ اب جو کچھ اس نے سوچا وہ محض رومانٹسزم ہے۔ تضییع وقت ہے۔

اس نے سونے کی کوشش کی مگر تھک جانے کے باوجود اسے نیند نہیں آئی۔ اس نے کتاب اٹھائی اور پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ بہت سے صفحے پڑھ گیا مگر پھر اس نے بیزار ہو کر کتاب بند کردی۔ اصل میں اس نے اپنے رومانٹسزم پر قابو تو پا لیا تھا مگر لگتا تھا کہ اس کے اندر کسی علاقہ میں بدستور بغاوت کی آگ بھڑکی ہوئی ہے۔ جیسے یہ باغی علاقہ اپنی خودمختاری کا اعلان کردے گا۔ اس نے بغاوت کو سختی سے کچلنے کی کوشش کی اور اپنے ارادے کو پورے شعور کے ساتھ بروئے کار لایا۔ مگر بدامنی قائم رہی۔ جیسے دو ساتھ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ اور اس کی ہستی بیچ کو ریزہ ریزہ کر جائے گی اور اس نے کہ علم و حکمت کے موٹی کتابوں سے چن چن کر اپنی شخصیت کی تعمیر کی تھی۔ محسوس کیا کہ اس کے اعضا لیتی سے جوڑے گئے ہیں۔ اس نے محسوس کیا۔ کہ اس کے جوڑ بند کھل رہے ہیں اور وہ ایک ملبہ بنا جا رہا ہے۔

## پنجم اپریل۔

اس نے اس فقیر کی صورت صبح کی جس کے اعضارات کو بکھر جاتے تھے اور صبح کو جڑ جاتے تھے۔ اس نے اپنے آپ کو اکٹھا کیا اور اطمینان کا سانس لیا کہ مارچ گذر چکا ہے اور وہ صحیح و سالم نکل آیا ہے۔

بستر سے وہ اک اکساہٹ کے ساتھ اٹھا۔ آئینہ دیکھا۔ میلی چیپڑ بھری آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ وہ کتنے برسوں سے نہیں نہایا ہے۔ تولیہ کاندھے پہ ڈال وہ

غسل خانے میں چلا گیا۔

نہا دھو کر اس نے کپڑے بدلے، بال سنوارے۔ چلتے چلتے اس نے میز کی چیزیں درست کیں۔ پہلے خط کو اس نے بے تعلقی سے دیکھا۔ ایسے مٹھی میں ملا اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اور پھر وہ باہر نکل گیا۔

جب وہ گھر سے نکلا تو دن چڑھ چکا تھا۔ چاروں طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چار قدم میں اس کا نہایا دھویا برابر ہو گیا۔ بس اڈے پہ اچھی خاصی بھیڑ تھی کئی بسوں کو اس نے یہ سوچ کر گذر جانے دیا کہ ان میں رش بہت ہے لیکن جب رش کسی طرح کم نہ ہوا تو اس نے ہمت کی اور ریلا توڑ کر تا بس میں گھس گیا۔

پسینے میں بھیگے میلے مسافر اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں اس طرح کھڑے تھے کہ اس کے لیے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیا وہ اپنی سفید قمیض کو اس غلاظت بھری بس سے سلامت لیکر نکل سکتا ہے۔

رفتہ رفتہ وہ اپنی سفید قمیض کو بھول گیا بس کی بساند اس کے دل و دماغ میں اتر رہی تھی۔ اس نے جانا کہ مری ہوئی مکھیوں کے انبار کے درمیان کھڑا ہے۔

اس نے ایک بار پھر بچنے کی کوشش کی۔ ایک مسافر کے اترنے پر وہ پسینے میں شرابور کالے بھجنگ آدمی کے برابر سے ہٹ کر آگے سرک گیا۔ یہ قدرے بہتر جگہ تھی۔ وہ آسانی سے سانس لے سکتا تھا۔

ایک گوری گردن اس کے سانس کی زد میں تھی۔ اس نے اوپر سے نیچے تک ہرے بھرے بچھائے کو نظر بھر کر دیکھا۔ پھر اس کی نظر ان شاداب لمبی باہوں پہ گئی جو کھوے تک کھلی ہوئی تھیں۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ مگر پھر اسے احساس ہوا جیسے وہ اس شاداب جسم کو ایک بے تعلقی سے دیکھ رہا ہے پھر اس گلشن بدن کو نظر بھر کر دیکھا، اور دیکھتا رہا۔ مگر اسے دیکھتے ہوئے اس کی طبیعت اداس ہوتی چلی گئی۔ اور اس وقت اسے احساس ہوا جیسے وہ سالم نہیں ہے۔ جیسے اکٹھا ہوتے

ہوئے اس کا کوئی ریزہ، کوئی کنکی باہر پڑی رہ گئی ہے۔ جیسے اس کے جہنم کا کوئی انگارہ کہیں باہر پڑا دہک رہا ہے۔ میری ذات میرا جہنم ہے۔ میرے جہنم کے سب انگارے میرے اندر رہنے چاہئیں۔

اپنے جہنم سے باہر نکلنے کی نیت باندھتے ہوئے اس نے سوچا کہ اس بھلی لڑکی شاکرہ کے اس کے پیچھے دو فون بھی آ چکے ہیں، خط بھی آ چکا ہے اس سے ملنا چاہیئے۔ مگر اس ارادے سے بھی اس کے اندر گرمی پیدا نہیں ہوئی اور وہ اس بس سے یوں اترا جیسے اس پہلے ہجوم میں پھنس کر وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔

بس سے اتر کر وہ آگے جانے کی بجائے گھر کی طرف واپس چلا۔ میری رات ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ میرے اجزا ہنوز منتشر ہیں۔ اور چلتے ہوئے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جیسے اس کے جہنم کے انگارے رستے میں گرتے چلے جا رہے ہیں اور گھر پہنچتے پہنچتے وہ بجھ جائے گا۔

اپنے بکھرے انگاروں کے ساتھ وہ واپس گھر پہنچا۔ کمرے میں داخل ہو کر سب سے پہلے اس کی نظر ردی کی ٹوکری پر گئی۔ اس نے وہ مڑا تڑا خط نکالا۔ اسے احتیاط سے تہہ کیا اور پھر میز پر رکھ دیا۔ اور اس نے ڈائری میں یکم اپریل کا صفحہ کھول کر لکھا۔ ۳۱ مارچ، پھر وہ اگلے ورق الٹتا چلا گیا اور ان پر لکھتا چلا گیا ۳۱ مارچ، ۳۱ مارچ، ۳۱ مارچ۔

○

# فراموش

سڑک سے ذرا ہٹ کر اونچے اونچے دودھیا کھمبے، سیمنٹ کا اجلا چبوترہ اور وہ حوض جس میں شفاف چمکیلا پانی ایک متوازن رفتار اور آواز کے ساتھ نالیوں کے ذریعہ بہتا اور نکلتا رہتا، وہ مقفل کوٹھڑی جس پر سرخ لفظوں میں لکھا ہوا تھا "خطرہ ہے"۔ اور ان سب سے ہٹ کر بیس تیس قدم پرے ایک سبک سفید مختصر سی کوٹھی جیسے کبوتری نے ابھی ابھی انڈا دیا ہو، ان سب سے مل جل کر کچھ ایک ہی قسم کی فضا پیدا ہوتی تھی یا وہ سب سے مل جل کر ایک ہی قسم کی فضا سے پیدا ہوئی تھیں۔ نرم نرم اُجلی اجلی فضا، لیکن سڑک نہ تو یہاں سے شروع ہوتی تھی اور نہ یہاں ختم ہوتی تھی۔ اپنے محلے کی گلیاں طے ہو چکتیں تو آبادی ختم ہوتی نظر آتی اور وہ سڑک شروع ہو جاتی جو آبادی سے باہر بھی تھی اور آبادی کی نشانیاں بھی رکھتی تھی۔ کچّے میں اتر کر کسی بیچے نیم سے ایک ٹہنی توڑ کر مسواک بنانا اور دانتوں سے چباتے ہوئے پھر اسی لمبی سڑک پہ ہولینا چلتے چلتے چونگی کی چوکی جہاں کبھی میلے اجلے زرد خربوزے، کبھی ہری ہری ککڑیوں کی چھابڑی، کبھی گہرے ہرے کریلوں سے لدے گدھے کھڑے نظر آتے۔ پھر وہ رول رول کرتا ہوا رہٹ جس کا اونٹ اِدھر ُادھر دیر سے بےخبر اسی بےکیف سے انداز میں چکر کاٹتا رہتا۔ پھر ٹیوب ویل کا سیمنٹ والا حوض اور وہ کھمبے اور وہ کوٹھی

کوٹھی سے آگے بہت دور تک دونوں طرف کھلا میدان جہاں کہیں کہیں بہت دور بہت سی بھینس خواب میں چلتی اور چرتی نظر آتیں۔ اور اسکے بعد اچانک سڑک موڑ کھاتی اور مشن اسکول کی سرخ عمارت سامنے آجاتی اور اس سے خاصی دور بھٹے کی خاموش کالی چمنیاں دکھائی دیتیں جو قریب آتی جاتیں۔ قریب آتی جاتیں اور پھر سامنے سے پیچھے کیطرف ہو جاتیں۔ اور اسکے بعد ایکاایکی ریل کی پٹری سڑک کو کاٹ جاتی۔ یہ اپنی آخری حد تھی۔ لوہے کا وہ سفید کٹہرا کھلا ہو یا بند میں نے کبھی پٹری کو عبور کرنے کی خواہش ہی محسوس نہیں کی۔ فوراً پلٹ پڑتا۔ نیم کے کڑوے سفید ریشوں سے دانتوں کو ملتا دلتا، آموں کے گھنے درختوں کے نیچے سے ہوتا ہوا کہ شاید کوئی کچی امبیا ہاتھ پڑ جائے۔ بھٹے کی چپ چاپ چمنیوں اور مشن اسکول کی سرخ عمارت اور خواب میں چلتی ہوئی اور چرتی ہوئی بھینسوں کی معین نشانیوں سے گزرتا ہوا سیمنٹ والے حوض پر پہنچ کر دم لیتا۔ دانت صاف کر کے کلی کرتا، منہ ہاتھ دھوتا اور چپل اتار، مٹی میں اٹے ہوئے پیر ٹھنڈے پانی میں ڈال دیتا۔ عجب فرحت ہوتی۔

فرحت اور آسودگی تو اس فضا میں رچی ہوئی تھی۔ جانے دن بھر یہی عالم رہتا تھا یا یہ فضا اس وقت سے مخصوص تھی۔ کبھی رات کو بہت حبس ہوا تو بے شک اسوقت کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ لڑکے حوض میں چھلانگیں لگاتے پانی اڑاتے دکھائی دیتے تھے، ویسے تو خاموشی ہی رہتی تھی۔ بس سیمنٹ کی نالیوں میں رکتا بہتا اجلا پانی بچوں کی مدھم کلکاریوں جیسا شور پیدا کرتا رہتا۔ یا کبھی کبھی کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ربڑ کی ایک سفید گیند گدّے کھانے لگتی۔ میں ٹھٹھک جاتا۔ اس خاموش فضا میں یہ ننھی سی بات بھی ایک شور، ایک واقعہ بن جاتی۔ کم از کم ایک دفعہ تو میں چونک ہی پڑا تھا۔ گیند کے پیچھے پیچھے ایک جوان سا لڑکا کہ جسے نوکر لگتا تھا دوڑتا آتا اور بغیر کسی طرف دھیان دیئے گیند اٹھا کر اسی یکسوئی سے واپس دوڑتا اور کوٹھی میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔ کبھی کبھی کے اس واقعہ سے ہی مجھے اندازہ ہوا تھا کہ کوٹھی غیر آباد نہیں ہے اور انجنیئر صاحب کے نام کی جو تختی دروازے پہ آویزاں ہے وہ معنی اور مطلب رکھتی ہے۔ سامنے سڑک پہ گدّے کھاتی گیند کو دیکھ کر کبھی تو میں یوں چونکا کہ اس سفید ہلکی پھلکی کوٹھی کا کوئی حصہ اچھل کر سڑک پہ آ پڑا ہے۔ کھلی فضا میں گول گول خطوں اور خموں والی سفید عمارت

بیچ بیچ میں یوں لگتا کہ ربڑ کی بہت سی گیندوں کو اوپر تلے رکھ کے کوٹھی بنائی گئی ہے۔

پھر ایک اور واقعہ ہوا۔ ننھا مگر نیا۔ کوٹھی کے عین سامنے سڑک پہ چلتے ہوئے میرے قدم رک گئے۔ جیسے ایک ساتھ سامنے دیوار آ گئی ہو یا جیسے سامنے ریل کی پٹڑی رستہ کاٹ رہی ہو اور چوکیداروں نے اچانک کٹہرا بند کر دیا ہو۔ چکنی کالی سڑک پر سفید چاک سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ فراموش چاہئے پھر میں چل پڑا لیکن ایک مرتبہ تو میں ٹھٹھک ہی گیا اور وسوسے میں پڑ گیا کہ اس رستہ کاٹتی لکیر کو پھلانگوں یا نہ پھلانگوں۔ 'فراموش' کے لفظ سے باتیں اور یادیں بھی تو وابستہ ہیں۔ شاید ان کا یہ کرشمہ ہو۔ آموں کے موسم میں یہ لفظ میرے بچپن میں اچھے خاصے ایک دھمکے کا کام کرتا تھا۔ کسی نے بے خبری میں ہاتھ میں دوگار آم تھما دیا اور کھٹ سے کہہ دیا۔ فراموش' اور ہاتھوں میں ایک زنجیر سی بندھ گئی۔ یا جیسے اچانک کسی نے سارا جسم رسی سے کس دیا ہو۔ چینی کے پلاٹ پہ بڑے تکلف سے سرپوش ڈھکا ہوا' خیال ہوتا کہ کوئی تقریب ہوئی ہے اور کوئی بہت بڑھیا لذیذ شے اس تقریب سے بھیجی گئی ہے، اور اتنے میں ہاتھ سرپوش کی طرف بڑھتا اور اچانک ایک للکار' فراموش' جیسے کسی نے جادو کی چھڑی چھوا دی ہو، یا کوئی دعا پڑھ کے چھو کر دی ہو، یا کنکریاں پڑھ کے مار دی ہوں۔ ہاتھ دوگار آم پہ جما رہ جاتا دو سو آم نذر کیجئے۔ اور اس قید بے زنجیر سے، اس جکڑی ہوئی رسی سے جان چھڑائیے۔

دوسرے دن جب میں پھر وہاں سے گزرا تو وہ لکیر باقی تھی اگرچہ ادھ مٹی ہو گئی تھی، اور اس سے مجھ پر کھلا کہ اپنے اس خاص وقت پر موقوف نہیں۔ سارے دن ہی اس سڑک پہ آمد و رفت کا سلسلہ برائے نام رہتا ہے۔

کچھ حرفی ادھ مٹی لکیر مٹی میں اٹتی گئی۔ مٹتے مٹتے بالکل ہی مٹ گئی بات آئی گئی ہوئی۔ اپنا ورد اسی طرح جاری رہا۔ سڑک کے موڑ سے گزر کر مشن سکول کی سرخ عمارت سے پرے۔ بھٹے کی خاموش کالی چمنیوں سے اُدھر ریل کی پٹڑی کو چھونا، چھو کر پلٹنا، اور سیمنٹ والے حوض میں مٹی اٹے ہوئے پیر ڈالنا، منہ ہاتھ دھونا، اور واپس گھر کو ہو لینا۔

فراموش...... اپنے ورد میں ایک گرہ پھر پڑی۔ لیکن اتنی ہلکی کہ نہ تو زمین نے قدم پکڑے اور

نہ یہ کرید ہوئی کہ سفید اینڈ اسی دیوار کو کس نے کوئلے سے کالا کیا ہے۔ وہی کچا پکا خط ٹیڑھے میڑھے خم اور دائرے الٹا ایک اطمینان سا ہو گیا کہ کسی راہ چلتے نٹ کھٹ لڑکے کی وہ شرارت نہیں تھی۔ یہیں کہیں کوئی بچہ رہتا ہے۔ شاید اسی کوٹھی والا گیند کھیلنے والا بچہ ہو، جسے موسم کے بہانے اس لفظ کا چسکا پڑا ہے۔

واپسی میں میں نے دیکھا کہ ایک شخص کہ اسکی پیٹھ میری طرف تھی اور شب خوابی کے لباس اور ادھیڑ عمری کے باوصف تیور سے افسری کی جھلکی کھاتا تھا۔ ہاتھ میں چھڑی لیسے دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور مالی سر نیوڑھائے دیوار یوں صاف کر رہا ہے جیسے اس میں ساری خطا اسی کی ہے۔

دوسرے تیسرے دن کا ذکر ہے کہ اسی مقام پر اسی خط میں وہ لفظ پھر لکھا نظر آیا، اور میرے واپس ہوتے ہوتے وہ پھر صاف کر دیا گیا تھا۔ اسکے بعد ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ میں نے جاتے ہوئے وہ لفظ لکھا دیکھا اور واپسی میں وہ مٹایا جا چکا ہوتا یا مٹایا جا رہا ہوتا۔

انہی دنوں باہر جانا نکل آیا۔ باہر جانا تو ہوتا ہی رہتا تھا۔ کبھی محصول وصول کرنے گاؤں کو، کبھی مقدمے کے چکر میں شہر کو۔ آج تھانے میں کھڑے ہیں تو کل تحصیل میں اور پرسوں ضلع کچہری میں۔ زیادہ سے زیادہ تین دن چار دن، کسی اہلکار نے بہت ستایا تو ہفتہ عشرہ ہو گیا۔ پر اب کے تو پورے پندرہ دن لگ گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ اتنے دن کی واپسی پر بھی موسم ویسا ہی تھا۔

دوسرے دن جب میں نے اپنا ورد پھر شروع کیا ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ لفظ اسی مقام پر اسی خط میں پھر لکھا ہوا ہے۔ مگر حیرانی کی اب کونسی بات رہ گئی تھی۔ بلکہ اب تو اس لفظ کے مٹنے اور نقش ہونے کی تکرار بھی اپنے ورد کا جزبن چلی تھی۔ ہاں حیرانی اس پہ ہوئی کہ تکرار کی یہ زنجیر ٹوٹ گئی واپس میں لفظ کو جوں کا توں دیکھ کر گمان ہوا۔ کہ آج انجینئر صاحب اور انجینئر صاحب کے ملازم دونوں کی نگاہ چوک گئی مگر حد ہو گئی کہ دوسرے دن بھی وہ لفظ اسی خط میں اسی مقام پر اسی طرح لکھا ہوا تھا۔ اب ماتھا ٹھنکا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ سو سو طرح کا شک پڑا کہ انجینئر صاحب کیا بلیسے دورے پہ نکل گیا یا کہیں تبادلہ تو نہیں ہو گیا۔ کیا خبر ہے کہ بیمار پڑے

ہوں۔ گمانوں کی ڈوری لمبی ہوتی گئی۔ مگر گتھی گتھی ہوئی رہی۔

برسات اب کی بار دیر سے لگی۔ تپتی دوپہر دن کا سلسلہ ٹوٹنے ہی میں نہ آتا تھا۔ دن کو ورات کو جس۔ اور آندھی کا کوئی وقت مقرر نہ تھا کہ کبھی دن ڈھلنے سے پہلے اندھیرا ہو جاتا اور کبھی رات کی اندھیری میں اندھیاری چلنے لگتی۔ کوٹھوں اور منڈیروں پہ کتنی مٹی اٹ گئی تھی۔ اس کا اندازہ تو پہلا چھینٹا پڑنے پہ ہوا۔ ایک روز صبح ہی صبح آنکھ کھلی تو ہر چیز دُھلی دھلی اور ٹھنڈی ٹھنڈی نظر آئی جس نیم سے روزانہ ٹہنی توڑ کے مسواک بناتا تھا وہ نہا دھو کر کتنا ہرا بھرا ہو گیا تھا۔ درخت اور کھمبے اور دیواریں سب ہی میں ایک شادابی کی رو دوڑ رہی تھی۔ ہاں سیمنٹ والے حوض میں آج پانی نہیں چل رہا تھا۔ بس بارش کا مٹیالا پانی رکا کھڑا تھا۔ انجینئر صاحب کی کوٹھی بھی جو لوؤں اور آندھیوں کی گرد سے زرد پڑ چلی تھی۔ پھر سفید اندا سی نظر آنے لگی اور وہ لفظ، کالے کوئلے سے لکھے ہوئے حرف ڈھل کر روشن روشن ہو گئے تھے۔

برسات کیا لگی کہ مینہ کی جھڑی لگ گئی۔ دن بارش، رات بارش سوکھے تالاب منہا منہ بھر گئے خستہ چھجوں کی لکڑی بھیگ بھیگ کے کالی پڑ گئی اور گلنے لگی اور اس میں سے سفید سفید سانپ کی چھتریاں ابھرنے لگیں۔ لباس کی ننھی پتیاں پھیلتی گئیں۔ چوڑی ہوتی ہوگئیں، پتھریلی منڈیروں پہ سبز و سیہ کائی اور لکڑی کے گیلے کواڑوں پہ سفید پھپھوندی جمنے لگی۔ انجینئر صاحب کی کوٹھی کی سفید دیواروں پر بوسیدگی کے ایسے آثار نمایاں نہیں تھے۔ ہاں وہ لفظ دھندلاتا جا رہا تھا۔ خموں کی پھیلی ہوئی سیاہی کو دیکھ کر یوں لگتا کہ اسی کے بل کھل رہے ہیں۔ ف کا نقشہ تو بالکل ہی مٹ گیا۔ ش کے تین نقطے ہلکے پڑتے گئے پھیلتے گئے اور مدغم ہو کر ایسے بن گئے جیسے تتلی پتھرا رہی ہو۔ مجھے فکر ہوتی کہ کہیں یہ لفظ بالکل ہی نہ مٹ جائے دراصل اپنا اس لفظ سے ایک رابطہ سا قائم ہو گیا تھا۔ اس سڑک کی یوں کس چیز سے اپنا رابطہ نہیں۔ لیکن بعض خاص خاص چیزیں اپنے لیے نشانیوں کا بلکہ سنگ میل کا مرتبہ رکھتی ہیں اپنے اس روزانہ کے چھوٹے سے سفر کی نوعیت خاصی عجیب ہے۔ منزل ہی نہیں میل اور سنگ میل بھی اپنے مقرر کئے ہوئے ہیں۔ چنگی کی چوکی، رہٹ، مشن اسکول کی سرخ عمارت بھٹے کی خاموش چمنیاں۔ یہ سنگ میل ہی تو

ہیں۔ اب یہ نقطہ بھی ایک سنگِ میل بن گیا تھا۔ اس سنگِ میل کو چھوتے ہی لگتا کہ باقی میل یوں طے ہوئے اور ریل کی پٹری اب آئی۔ کبھی کبھی یہ سنگِ میل منزل بن جاتا۔ گویا اسے چھونے کے لیے ہی گھر سے نکلے تھے اور اگر ریل کی پٹری تک جارہے ہیں تو محض وضعداری کی خاطر۔

برسات ڈھلنے لگی۔ مینہ کا زور ٹوٹ چلا۔ گھٹا ایسی گھر کے آتی، جیسے ٹوٹ کے پانی پڑے گا، مگر دم بھر پانی پڑتا اور آن کی آن میں مطلع صاف۔ بڑی بڑی سلونی جامنوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی بدرنگ جامنیں آئیں۔ پھر چھوٹی جامنیں بھی غائب ہونے لگیں۔ چولائی کے تیتے ہرے سے سرخ اور سرخ سے پیلے ہوئے سانپ کی چھتریاں جس تیزی سے پھولی تھیں۔ اسی تیزی سے مرجھائیں۔ طوطوں کے بچے نیم کی کھکھلوں سے نکل کر شاخوں پر آگئے تھے۔ اور ٹہنی ٹہنی پھدکتے پھرتے تھے۔ منہا منہ تالاب گھٹتے گئے گھٹتے گئے یہاں تک کہ پانی بھینسوں کے گھٹنوں تک رہ گیا۔ گری ہوئی چھتوں، جھکی ہوئی کڑیوں اور جھجوں اور چونا اترتی دیواروں کی مرمت شروع ہو گئی تھی اور احاطوں میں سے ڈھئی ہوئی دیواروں کا ملبہ اٹھنے لگا تھا۔ انجینئر صاحب کی کوٹھی کے احاطے میں چونے کی بوری رکھی نظر آئی تو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ سفید بدرنگ دیواروں کا جائزہ لیتے ہوئے نظریں اپنے ٹھکانے پر جاکر ٹک گئیں۔ ف کا نقطہ پہلے ہی معدوم ہو چکا تھا۔ اب میم کی گھنڈی بھی کھل چلی تھی۔ شین کی پتلی کچھ اور پتھرا گئی تھی۔ رسی کے بل کھل رہے تھے۔ بکھر رہے تھے۔ مگر اب تو کوچی کے ایک اشارے پر یہ پورا کا پورا اچھر حرفی افسانہ حرف غلط بن جائے گا۔ اس خیال سے جی اک ذرا اداس سا ہو گیا۔ پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ یہ نقطہ سنگِ میل نہیں، رستے کا ساتھی تھا۔ جو اپنی جگہ پہ کھڑا دور سے اشارہ کرتا رہتا تھا اور دور تک اشارہ دیتا رہتا تھا۔

یہ چونے کی بوری احاطے میں ڈیڑھ دو دن جوں کی توں رکھی رہی۔ پھر بڑے بڑے دو ڈھول رکھے نظر آئے جن میں قلعی گھل رہی تھی، اور دو تین کوچیاں اور ایک سیڑھی تھی۔ دوسرے دن کوٹھی کو میں نے ادھورئی حالت میں دیکھا۔ اندر کے بڑے حصے میں قلعی ہو چکی تھی مگر باہر کی دیواروں کو ابھی نہیں چھوا گیا تھا۔ دوسرے دن دیکھا کہ ساری کوٹھی پہ سفیدی ہو گئی ہے...... مگر میں دنگ رہ گیا...... باہر کی دیوار پر اس اہتمام سے سفیدی کی گئی تھی کہ فراموش، اپنی جگہ پہ

قائم تھا اور اس سلیقے سے کہ چونے کی ایک بوند کسی حرف پہ نہیں پڑی تھی۔ میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور گویا ایک رسی نے میرے ہاتھ پیروں کو اس طرح جکڑ لیا کہ میں نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔

اس کے بعد ہی میں پہلے دورے پہ نکل گیا۔ اب کے دورہ لمبا تھا۔ واپس آیا اور اس کوٹھی کے برابر سے نکلا تو دیکھا کہ برآمدے میں تین چار بچے بے طرح دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ اندر کے کمرے سے اسکے خلاف نسوانی احتجاج کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر ایک مردانہ ڈانٹ۔ مجھے بڑا اچنبھا ہوا۔ بچے بڑے عورتیں، مہین اور موٹی اور نرم رسیلی اور درشت آوازوں کے یہ رنگ برنگے تار کہ ایک جان بن کر پھیل رہے تھے۔ آخر یہ نئی زندگی اچانک کیسے اور کہاں سے پھوٹ پڑی خاموش برآمدے اور احاطے، شیشے والے بند دروازوں اور گنگ کمروں کی کایا ایکا ایکی کیسے پلٹی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بس سوچ لیا کہ کہیں سے مہمان آئے ہونگے۔

دوسرے دن کوٹھی کا چولا بدلا نظر آیا۔ دور سے پتہ چل رہا تھا کہ سفیدی ہوئی ہے۔ پھاٹک کے باہر قلعی کے ادھ بھرے ڈھول بھی رکھے تھے، کہ جیسے راج کام کرتے کرتے انہیں چھوڑ گئے ہیں اور آکے پھر کام سے لگ جائیں گے۔ میرے قدم نادانستہ تیز تیز اٹھنے لگے۔ کوٹھی کے قریب پہنچتے ہی میری نگاہ نے اسی باہر والی دیوار کو ٹٹولا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ ساری دیوار پہ سفیدی پتی ہوئی تھی۔ اور سفیدی پہ نقطوں شوشوں اور خموں سے پورا ہوا وہ جالا سفیدی میں ڈوب چکا تھا۔ اچانک پھر کسی نے میرا رسہ کاٹ دیا اور ایک ان دیکھی رسی مجھے جکڑے لے رہی تھی۔

ہاتھ میں وہی لمبی سی قینچی، باہر کی روش پہ دورویہ جھاڑیوں کی ہری ہری گھنی شاخوں اور پھننگوں کو تیزی سے کاٹتا چلا جا رہا تھا۔ اب تو واقعی مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ یوں بھی اب وہ مالی ہی لگتا تھا۔ کوئی پراسرار مخلوق نظر نہیں آتا تھا کہ مجھے جھجک ہوتی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے سادگی سے رکا اور اسی سادگی سے پوچھا۔ "انجینئر صاحب کے تو آج بہت مہمان آئے معلوم ہوتے ہیں"؟

"مہمان تو کوئی نہیں" مالی کی قینچی اسی طرح چلتی رہی۔ "نئے انجینئر صاحب کے گھر والے ہیں"۔

"نئے انجینئر صاحب" میں چونکا اور نگاہ فوراً نام کی تختی پہ گئی۔ تختی واقعی بدلی ہوئی تھی۔ مالی اسی طرح ہاتھ روکے بغیر سادگی سے بولا۔

"ہاں جی اب نئے انجینئر صاحب آ گئے ہیں۔ پہلے انجینئر صاحب تو گئے"

"کہاں"؟ "انہوں نے پنشن لے لی۔"

"پنشن؟ اچھا؟" مجھے یہ بات نہ جانے کیوں اتنی عجیب معلوم دے رہی تھی چند لمحے خاموشی رہی۔

بس ہری شاخوں میں قینچی کے در در کرنے کی آواز آتی رہی۔ پھر مالی آپ ہی بولا، اور اس مرتبہ اس کی آواز میں افسوس کی بھی ایک کیفیت تھی۔ "اجی اچھا ہی ہوا کہ ان کی پنشن ہو گئی۔ جب سے ان کا بیٹا مرا تھا ان کا دماغ چل بے چل ہو گیا تھا۔"

"بیٹا؟ اچھا بیٹا مر گیا تھا انجینئر صاحب کا؟" یک بیک الجھی ہوئی ڈور کا سرا ملتا دکھائی دیا

"نئیں جی وہ بیٹا نئیں تھا"۔ مالی نے قینچی رد کی۔ قینچی زمین پر ڈال کمر سیدھی کر، میری طرف رُخ کر کے کھڑا ہو گیا۔ انجینئر صاحب بچارے تو اکیلے تھے۔ وہ ان کا لے پالک تھا۔ بہت لاڈ کرتے تھے اس کا۔ بس دو دم تھے۔ انجینئر صاحب اور لے پالک۔ اور کیا دیکھنا رہ گیا تھا انہیں۔ بس اسے دیکھ دیکھ کے جیتے تھے۔ نہ کسی سے ملنا، نہ کسی کے پاس جانا، نہ کوئی میل ملاقاتی۔ دفتر یا دورہ واں سے سیدھے گھر، نہ کوئی قصہ بکھیڑا، اسی کے ساتھ مگن رہتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسے لُو لگ گئی۔ کلی کی طریوں مرجھا گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" مالی کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر آپ ہی آپ بڑبڑایا، "انجینئر صاحب پھر اکیلے رہ گئے۔ بہت دکھی رہتے تھے بچارے۔ بالکل کھوئے کھوئے رہنے لگے تھے۔ نوکری سے بھی جی اچاٹ گیا تھا۔ اب دورے یہ بھی ایسے ویسے ہی جاتے تھے۔ بس اسی کا خیال ہر وقت رہتا تھا۔ اس کی ایک ایک چیز کو، گیند اور بلّے کو سنبھال کے دکھ چھوڑا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا ہی ہوا پنشن لے لی۔ بالکل چل بے چل ہو گئے تھے۔" اس نے آہستہ سے جھک کر قینچی اٹھائی۔ اور میری طرف دیکھے بغیر دوسری روش کی طرف ہو لیا۔ کھلے میدان میں کہیں کہیں بہت دور اکّا دکّا خواب میں چلتی اور چرتی ہوئی بھینس، پھر وہ دو دو بیر آموں کے لیے ثمر درخت کہ ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔ مشن اسکول کی سُرخ عمارت سے کہیں بہت آگے نکل کر بیٹھے کی کالی کالی چپ چاپ چمنیاں جو قریب ہونے کی بجائے دور ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ اس روز وہ لمبی اونچی نیچی گرد آلود سڑک کہ کبھی سیدھی چلتی اور کبھی ٹیڑھ کھاتی دکھائی دیتی اتنی لمبی لگی کہ میں بیزار ہو کر ریل کی پٹڑی کو چھوئے بغیر واپس ہو گیا۔

# بادل

وہ بادلوں کی تلاش میں دور تک گیا۔ گلی گلی گھومتا ہوا کچی کوئیا پہنچا۔ وہاں سے کچے رستے پر پڑ لیا اور کھیت کھیت چلتا چلا گیا۔ مخالف سمت سے ایک گھسیارا گھاس کی گٹھڑی سر پر رکھے چلا آرہا تھا۔ اسے اس نے روکا اور پوچھا کہ "ادھر بادل آئے تھے؟"

"بادل؟" گھسیارے نے اس تعجب سے کہا جیسے اس سے بہت انوکھا سوال کیا گیا ہو۔

"ہاں بادل" اور جب گھسیارے کی حیرت میں کوئی کمی نہ آئی تو وہ اس سے مایوس ہوا اور آگے چل کر اس نے کھیت میں ایک ہل چلاتے ہوئے کسان سے یہی سوال کیا "ادھر بادل آئے تھے؟"

کسان کی سمجھ میں بھی یہ سوال نہ آیا۔ اس نے ٹپٹا کر کہا "بادل؟" "ہاں بادل"

اصل میں وہ بادلوں کے متعلق ایسے پوچھ رہا تھا جیسے ڈھونڈنے والا راہ چلتے ہوؤں سے گم ہو جانے والے بچے کے متعلق پوچھتا ہے۔ شاید بادل بھی گمشدہ بچے تھے کہ وہ انھیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا اور ہر راہ چلتے سے پوچھ رہا تھا مگر کسی نے اسے تشفی بخش جواب نہیں دیا۔

سب سے پہلے آج صبح اس نے اماں جی سے یہ سوال کیا تھا "اماں جی، بادل کہاں گئے؟"

"کون کہاں گئے؟" اماں جی نے اس سے ایسے پوچھا جیسے اس نے بہت احمقانہ سوال کیا تھا

"بادل"

"بادل — ارے تیرا دماغ چل گیا ہے۔ جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو، ناشتہ کر اور اسکول جا۔"

اماں جی کے اس اندازِ بیان نے اس پر ایک ناخوشگوار اثر چھوڑا۔ اس نے بے دلی سے ہاتھ منہ دھویا، ناشتہ کیا اور کتابوں کا بیگ گلے میں ڈال سکول کے لیے گھر سے نکلا۔ مگر گھر سے نکلتے ہی اس کے ذہن میں پھر وہی سوال ابھرا، بادل کہاں گئے؟ اور اس کے ساتھ اسے رات کا وہ وقت یاد آیا جب اس نے بادل امنڈتے گرجتے دیکھے تھے۔ جب وہ سونے لگا تھا اس وقت آسمان بادلوں سے خالی اور ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی اور گرمی سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسے مشکل سے نیند آئی۔ پھر جانے کیا وقت تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ جو وقت بھی ہو اس کے لیے وہ آدھی رات تھی۔ دور آسمان پر بادل ایک گرج کے ساتھ امنڈ رہے تھے۔ بیچ بیچ میں بجلی چمکتی اور اس چمک میں وہ بادل بہت کالے کالے نظر آتے۔ اسے لگا کہ بہت زور کی بارش آئے گی۔ مگر اس میں نیند کتنی خراب ہوتی۔ بس اسی اندیشے سے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایسے ہو گیا جیسے اسے خبر ہی نہیں ہے کہ آسمان بادلوں سے بالکل خالی تھا اور صحن میں بوندیں پڑنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اسے پہلے تعجب ہوا۔ پھر افسوس ہوا۔ تعجب اس پر کہ بادل اتنے امنڈ گھمنڈ آئے تھے اور برسے نہیں پھر گئے کہاں۔ افسوس اس پر کہ وہ سو کیوں گیا۔ جیسے وہ جاگتا رہتا تو بادل آنکھوں سے اوجھل نہ ہو پاتے اور پھر برس کر ہی جاتے۔ وہ بارش ہو جاتی تو موسم کی پہلی بارش ہوتی۔ مگر اس کے سوتے ہوئے بادل گھر کر آئے اور چلے گئے۔ بارش کی کوئی بوند نہیں پڑی۔ برسات کا موسم خالی گزرا جا رہا تھا۔ اس نے چلتے چلتے ایک بار پھر آسمان کا جائزہ لیا۔ دور تک کوئی بادل نہیں تھا۔ خالی آسمان میں سورج عین اس کے سر پر چمک رہا تھا۔ وہ سکول کا راستہ چھوڑ کر کھیتوں میں نکل گیا۔

کھیتوں کے بیچ پتلی پتلی بٹیوں پر ہوتا ہوا وہ دور نکل گیا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ اس کا بدن پھنکنے لگا، حلق خشک ہو گیا۔ کئی کھیت پار کرنے کے بعد گھنی چھاؤں والا ایک پیڑ دکھائی دیا کہ اس

کی چھاؤں میں کنواں چل رہا تھا۔ گویا ریگستان میں چلتے چلتے نخلستان آگیا۔ اس نے درخت کی چھاؤں میں پہنچ کر کتابوں کا بیگ ایک طرف رکھا۔ کنوئیں کے پاس پہنچ کر اس نے رہٹ سے نکلتے ہوئے پانی سے پیر دھوئے۔ ہاتھ منہ دھویا اور پھر جی بھر کر پانی پیا۔

منہ ہاتھ دھو کر پانی پی کر آنکھوں میں ٹھنڈک اور روشنی آئی۔ اب اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ کنوئیں کے پاس ہی ٹوٹے سے مونڈھے پر ایک بڑے میاں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ بڑے میاں کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنا چاہا مگر پھر ہمت چھوڑ بیٹھا۔ آخر اس نے ہمت باندھی اور بولا "باباجی! ادھر بادل آئے تھے؟"

بڑے میاں نے حقہ پیتے پیتے اسے غور سے دیکھا۔ پھر بولے "بیٹا، بادل چھپ کر تو نہیں آئیں گے۔ جب گھر کر آئیں گے تو آسمان زمین کو پتہ چل جائے گا۔"

مگر رات تو بادل آئے تھے اور کسی کو پتہ ہی نہ چلا۔"

"رات بادل آئے تھے"؟ بڑے میاں نے کچھ سوچا۔ پھر اونچی آواز سے اللہ دین سے مخاطب ہوئے "اللہ دین رات بادل آئے تھے؟"

اللہ دین بیلوں کو ہانکتے رکا۔ بولا "میں تو جی رات کھاٹ پر بیٹھ لگاتے ہی سو گیا تھا۔ مجھے پتہ نہیں۔"

پھر بڑے میاں بولے "بیٹا! بادلوں کے خالی آنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں ایسے علاقے میں رہ چکا ہوں جہاں دس سال سے بارش نہیں ہوئی تھی۔"

"دس سال سے"؟ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں دس سال سے، مگر بادل آتے تھے۔ جن دنوں وہاں تھا ان دنوں بھی ایک دفعہ بادل بہت گھر کے آئے تھے۔ مگر پانی کی ایک بوند نہیں پڑی۔"

"عجیب بات ہے۔"

"عجیب بات کوئی نہیں۔ بارش اس کے حکم سے ہوتی ہے۔ اس کا حکم ہوتا ہے تو بادل

برستے ہیں اس کا حکم نہیں ہوتا تو بادل نہیں برستے۔"

بڑے میاں کے اس بیان کے ساتھ ساتھ اس کے تصوریں پچھلی مختلف گھٹائیں امنڈ آئیں وہ گھٹائیں جو گھٹا ٹوپ اندھیرے کے ساتھ اٹھیں جیسے برس کر جل تھل کر دیں گی۔ مگر بوند برسائے بغیر گزر گئیں۔ وہ گھٹائیں جو چند بے معنی سی بدلیوں کی صورت میں آئیں اور ایسی برسیں کہ نالی نلیاں امنڈ آئیں۔

بڑے میاں نے تپتے آسمان کی طرف دیکھا۔ پھر بڑبڑائے "موسم گزرا جا رہا ہے پتہ نہیں اس کا حکم کب ہوگا۔"

جواب میں وہ بھی بڑبڑایا "مینہ برستا ہی نہیں۔ پتہ نہیں بادل آ کے کہاں چلے گئے۔"
"بیٹا کیا برسے۔ برسے گا تو خبریں آنے لگیں گی کہ سیلاب آ گیا۔ آسمان بخیل ہوگیا۔ زمین میں ظرف نہیں رہا۔ بارش ہوتی ہی نہیں۔ ہوتی ہے، تو سیلاب امنڈ پڑتا ہے۔"

بڑے میاں کی باتیں اس کی سمجھ میں کچھ آئیں کچھ نہ آئیں۔ وہ بیٹھا سنتا رہا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ کتابوں کا بیگ اٹھا، گلے میں ڈال اٹھ کھڑا ہوا۔

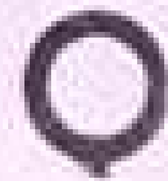
مٹی دھول اور دھوپ میں وہ دیر تک چلتا رہا۔ جن راستوں سے آیا تھا انہی راستوں پر لوٹ رہا تھا دھوپ اب بھی تیز تھی۔ مگر جب وہ کچی کوٹیا کے پاس پہنچا تو اسے لگا کہ ہوا میں ایک ٹھنڈی لکیر سی تیر گئی ہے اور قدموں کے نیچے مٹی کچھ سیلی سیلی ہے۔

بستی میں داخل ہوتے ہوئے اس نے دیکھا کہ رستہ یہاں سے وہاں تک گیلا ہے۔ درخت کہ اسکے نے وقت روز کی طرح دھول میں اٹے کھڑے تھے اب نہائے دھوئے نظر آ رہے ہیں اور نالہ کہ پچھلی برسات کے بعد سے خشک چلا آ رہا تھا، رواں ہو گیا ہے۔ خوشی کی ایک لہر اس کے اندر دوڑ گئی اب اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کے صحن میں جو جامن کا پیڑ کھڑا ہے وہ کتنا تر و تازہ ہوا ہے۔

گھر پہنچ کر اس نے فضا کو بارش کے حساب سے بدلا ہوا پایا۔ جامن سے بہت سے پتے پنیچے

گرے پڑے تھے اور گیلی مٹی میں لت پت تھے۔ باقی درخت نہایا دھویا کھڑا تھا۔ اور اماں جی ایک آسودگی کے لہجے میں کہہ رہی تھیں "اچھی بارش ہوگئی۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ میرا تو گرمی سے دم الٹنے لگا تھا۔"

جامن کی ٹہنیوں سے بوندیں ابھی تک ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔ وہ پیڑ کے نیچے کھڑا ہوگیا اور بوندوں کو اپنے سر پہ اور اپنے گالوں پہ لیا۔ اس کی نظر آسمان پر گئی۔ آسمان دھلا دھلا نظر آرہا تھا۔ اب وہاں کوئی بدلی نہیں تھی۔ اسے خیال آیا کہ وہ بادلوں کی تلاش میں دھوپ اور دھول میں کتنی دور تک گیا اور بادل اس کے پیچھے آئے اور برس کر چلے بھی گئے۔ اس خیال نے اسے اداس کر دیا۔ بارش میں بھیگی ساری فضا اسے بے معنی نظر آنے لگی۔



# اسیر

"اچھا تم یہاں کی سناؤ۔"

"یہاں کی؟ ——— یہاں کی کیا سناؤں؟"

اصل میں انور کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا۔ شعوری طور پر نہ سہی غیر شعوری طور پر اس نے یہ طے کر رکھا تھا کہ جو کچھ ہونا تھا وہیں ہونا تھا۔ سو وہ کرید کرید کے وہاں کے متعلق پوچھے جا رہا تھا۔ یہاں کے متعلق سوال ہوا تو جیسے وہ بے خبری میں پکڑا گیا۔

"یہاں کیا ہوا؟" جاوید نے پھر اپنے سوال پر اصرار کیا۔

"یہاں کیا ہوا!" وہ سوچ میں پڑ گیا ——— پھر بولا "یار یہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"کچھ بھی نہیں ہوا؟"

"سچی بات ہے، کچھ بھی نہیں ہوا۔ جو تم نے وہاں دیکھا اس کے مقابلے میں یہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"اچھا! ——— وہاں ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ یہاں بھی بہت کچھ ہو رہا ہوگا۔"

انور ندامت کے لہجے میں بولا ”ہاں یار یہاں کچھ نہیں ہوا۔“

”جنگ تو بہر حال یہاں بھی ہوئی تھی؟“

”ہاں جنگ تو ہوئی تھی۔“ انور نے بجھے سے لہجے میں کہا۔

گفتگو یہاں آکر خود بخود رک گئی۔ انور پوچھنے میں جو گرم جوشی دکھا رہا تھا وہ اب ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ جاوید نے بس یونہی پوچھ لیا تھا۔ زیادہ اشتیاق اور تجسس کا مظاہرہ اس نے نہیں کیا۔

انور پھر خود ہی بولا ”اصل میں یہاں باہر سے کچھ نہیں ہوا۔ جو کچھ ہوا اندر سے ہوا۔“

”باہر سے کبھی کچھ نہیں ہوتا“ جاوید نے سادگی سے کہا، ”جو کچھ ہوتا ہے اندر سے ہوتا ہے۔“

”ایسی بات تو نہیں ہے۔“ انور نے کسی قدر گرمی کے ساتھ کہا ”وہاں تو زیادہ تر باہر ہی سے ہوا۔ البتہ یہاں اندر سے زیادہ ہوا۔ اس لیے جنگ کے دنوں میں کم ہوا، جنگ کے بعد زیادہ ہوا۔“

”اچھا؟“

”ہاں!“

”کیا ہوا؟“

”ہڑتالیں، تالہ بندی، جلسے جلوس، مار دھاڑ، طلبا کے ہنگامے، گرفتاریاں ——

جاوید نے سامنے میز پہ پڑا ہوا تصویروں والا رسالہ اٹھایا اور الٹنے پلٹنے لگا۔ یہ رسالہ وہ صبح سے میز پر پڑا دیکھ رہا تھا مگر اس کو یا تو اُسے دیکھنے کی فرصت نہیں ملی یا دیکھنے کو جی نہیں چاہا۔ اس وقت اس رسالے نے اسے اپنی طرف کھینچا۔ اس کی تصویریں اسے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔

”یونیورسٹی میں تو اچھی خاصی خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ مورچے بن گئے اور سٹین گنیں آئیں پوری رات گولی چلی۔“

"اچھا ہے۔" جاوید مسکرایا۔

"کیا؟"

"یہ کارٹون۔" جاوید نے رسالہ انور کی طرف بڑھا دیا۔

انور نے کارٹون دیکھا۔ کچھ دیکھا کچھ نہ دیکھا۔ بے دلی سے کہا "ہاں اچھا ہے۔" اور چپ ہو گیا۔

"یار باہر نہ چلیں"۔ جاوید نے تجویز پیش کی۔

"ہاں چلیں۔"

"ہاں یار! گھر میں بیٹھے تو یہی ایک سلسلہ چلتا رہے گا۔ آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ وہی سوال وہی باتیں۔ یہ نئی اسیری ہے۔ چلو چلیں۔" وہ تڑت اٹھ کھڑا ہوا۔ اندر کے دروازے کے قریب جاکر اونچی آواز سے کہا "میں ذرا انور کے ساتھ جا رہا ہوں۔" اور انور کو ساتھ لے کر باہر نکل آیا۔

"یار تمہیں سندھ کے فسادات کی خبریں ملی تھیں" انور کو یکایک خیال آیا کہ یہ سانحہ بہت سنگین اور المناک تھا۔ جاوید کو اس سے باخبر کرنا چاہیئے"

"ہاں ریڈیو پر خبریں سنی تھیں۔"

"ریڈیو کی خبروں سے کیا پتا چلتا۔ بہت المناک واقعات ہوئے۔ بہت لوگ مارے گئے بہت سے گھر سے بے گھر ہو گئے۔ تم نے لیاقت مارکیٹ تو دیکھا تھا۔ کتنا بڑا بازار تھا۔ پورا بازار جل کر راکھ ہو گیا۔ اور کوئی آدمی نہیں بچا ——"

"یار یہ پیٹ پہ اور رانوں پہ خانے سے کیسے بنے ہوئے ہیں؟" جاوید ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

انور بولتے بولتے بیچ میں رک گیا اور اسی طرف دیکھنے لگا جس طرف جاوید دیکھ رہا تھا۔ یہ سینما ہال کے باہر آویزاں پوسٹر تھا جس پر نیم برہنہ عورت کی لانبی تصویر بنی تھی۔ اس کی بھری

بھری رانوں پر اور ناف تک کھلے ہوئے پیٹ پر چار خانہ بنا ہوا تھا۔ یہ تصویر جب انور آتے جاتے ادھر اُدھر دیکھتا تھا، اس وقت اسے بہت بری لگی "چھوڑو یار" اور دونوں آگے چل پڑے۔

"آئس کریم کھاؤ گے؟" انور دکان کے سامنے پہنچ کر یکایک رک گیا۔

"کھالیں گے۔"

آئس کریم کھاتے کھاتے جاوید کی نظروں نے اس لڑکی کا تعاقب کیا۔ جو فلیپر پہنے بڑے بڑے گول شیشوں کی عینک لگائے نمودار ہوئی تھی۔ اور اس وقت تک تعاقب جاری رکھا جب تک وہ اندر داخل نہیں ہوگئی۔

"یار انور! ادھر میرے پیچھے بیل باٹم تو غائب ہی ہوگیا۔"

"اور چست پتلون بھی۔"

"چست پتلون بھی اور چست قمیض بھی ——— یار انور! تم نے بتایا نہیں کہ یہاں کیا ہوا؟"

"جو ہوا وہ تم دیکھ ہی رہے ہو۔" انور نے آئس کریم کھاتے ہوئے طنز کے لہجے میں کہا "بیل باٹم رخصت ہوگیا، فلیپر آگیا۔" "تم اسے چھوٹا واقعہ سمجھتے ہو؟"

"نہیں بہت بڑا واقعہ ہے۔" انور کا لہجہ اور بھی طنزیہ ہوگیا۔ رک کر بولا "کیا خیال ہے تمہارا اس بڑے واقعے کے بارے میں؟"

"میں یار ابھی فلیپر سے اپنے آپ کو مانوس نہیں کر پایا ہوں۔" آئس کریم ختم کرنے کے بعد اس نے پیالہ ٹوکری میں پھینکا "بس چلیں؟"

"ہاں چلیں۔"

دونوں آگے بڑھ لیے۔

انور اب اس سنجیدہ موڈ میں نہیں رہا تھا۔ پھر بھی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں جاوید کے تجسس کو دیکھ کر اس نے پوچھ لیا۔

"یار جب تم یہاں آئے ہو تو تمہارا کیا ردِ عمل تھا؟"

"ردِ عمل؟ میرا؟ کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے کہ اس لمبی اسیری کے بعد جب تم یہاں آئے تو تم نے کیا محسوس کیا؟"

"یار کمال ہے۔" جاوید چلتے چلتے پھر ٹھٹھک گیا۔

"کیا ہوا؟"

"یار اس نوجوان کو دیکھو، اس نے گلابی شلوار پہن رکھی ہے اور میرا خیال ہے کہ ریشمی ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں ہوا؟ اچھا؟" جاوید چپ ہو گیا۔ پھر بولا، "کیا ریشم اور رنگ نوجوانوں میں بہت فیشن ایبل ہیں؟ میں نے اور بھی نوجوانوں کو لال پیلے ریشمی کرتے شلواریں پہنے دیکھا ہے۔"

"ہاں اس کا اچھا خاصا رواج ہے۔ اچھا سنو، کڑھائی گوشت کھاؤ گے؟"

"کڑھائی گوشت؟"

"ہاں، یار کھانے کا وقت ہے۔ ابھی گھر کہاں جاؤ گے۔ کڑھائی گوشت کھاتے ہیں۔ پھر ذرا لمبی ٹہل کریں گے۔"

وہاں مجمع بہت تھا۔ سڑک پر دو رویہ موٹریں ہی موٹریں کھڑی تھیں۔ موٹروں سے پرے پورے سبزہ زار میں بلکہ جا بجا فٹ پاتھ پر بھی میزیں کرسیاں بچھی تھیں اور ہر میز بھری تھی۔ ان سے پرے بکرے کی ایک نہایت وسیع و عریض تصویر کے نیچے بکروں کی رانیں قطار اندر قطار ٹنگی تھیں۔ بھٹیاں گرم تھیں، شعلے لپک رہے تھے۔

"یار یہاں تو بہت لوگ ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ ابھی جگہ ملتی ہے۔" یہ کہتے کہتے انور نے دور پڑی ایک میز کو خالی ہوتے دیکھا۔ لپک کر گیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ میز فٹ پاتھ پر بچھی تھی۔ برابر ہی میں ایک کار کھڑی تھی جس کے سامنے والے ڈھکنے کو اس وقت بطور کھانے کی میز استعمال کیا جا رہا تھا۔

گوشت سے بھری ایک کڑھائی، اس پر جھکے ہوئے کچھ لڑکے کچھ لڑکیاں

"یار! یہ واقعہ بھی میرے بعد کا ہے۔" جاوید نے اردگرد کھاتے ہوؤں پر ایک نظر ڈالی

"کون سا واقعہ؟"

"یہی کڑھائی گوشت کا واقعہ۔"

"ہاں یہ اس شہر میں نئی ڈش ہے۔"

اس نے پھر اردگرد ایک نظر ڈالی۔ کاروں کی قطاروں پر، میزوں کرسیوں پر، کھانے والوں پر —— "یار یہ علاقے پہلے پہلے بہت خاموش ہوا کرتے تھے۔" رکا، پھر بولا "اور عجیب بات ہے کہ سب مجمع تکے کباب اور کڑھائی گوشت کا ہے۔ پہلے تکے کباب کی بھی اتنی دکانیں تو نہیں تھیں۔"

انور کی توجہ اس وقت بٹی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں بیٹیوں پر جمی ہوئی تھیں "اتنی دیر ہو گئی، ابھی تک لایا ہی نہیں۔"

جاوید نے اردگرد کا جائزہ تفصیل سے لیا۔ بچے، بڑے، عورتیں، مرد، نازک بدن خواتین، تنومند مرد، سب کھانے میں مستغرق تھے۔ ایک قریب کی میز پر ایک موٹا تازہ آدمی پسینے میں تر اور ادھر اُدھر دیکھے بغیر کھائے جا رہا تھا۔ ایک دوسری قریب کی میز پر ایک سوٹ بوٹ میں ملبوس شخص اور نفاست سے بندھی ساڑھی میں ایک چھریرے بدن والی خاتون۔ کڑھائی اب خالی ہو چلی تھی۔ خاتون کی پلیٹ میں ہڈیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اس وقت وہ چینی کی ہڈی بڑے استغراق سے چچوڑ رہی تھی۔ اس میز سے پرے اور میزیں تھیں کہ ہر میز پہ گوشت سے بھری کڑھائی رکھی ہوئی اور لوگوں کے منہ میں جاتے ہوئے بڑے بڑے لقمے اور چلتے ہوئے منہ۔ جبڑے کہ اس کے تصور میں بڑے ہوتے چلے گئے اور حیرت دہشت میں بدلتی چلی گئی۔

"یار انور" اس نے تشویش کے لہجے میں کہا "لوگ اب بہت کھانے لگے ہیں۔"

انور نے کچھ نہ سنا کہ اب کڑھائی آ پہنچی تھی۔ "لو یار کھاؤ۔"

جاوید نے منہ میں لقمہ رکھا اور سوچا، میرا جبڑا کتنا بڑا ہے۔

"یار تم کھا نہیں رہے!"

"کھا رہا ہوں۔"

"کہاں کھا رہے ہو۔ یہاں تکلف سے کام نہیں چلے گا۔ یہ کڑھائی گوشت ہے۔ اسے کھانے کے لیے آدمی کو تھوڑا وحشی ہونا پڑتا ہے۔"

اس نے انور کی خاطر کئی لقمے تیزی سے لیے، مگر پھر اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ اس کا خیال کہیں سے کہیں جا نکلا "یار خالد کا کیا حال ہے۔ میں ابھی تک کسی سے ملا ہی نہیں ہوں۔"

"خالد کا حال؟" انور نیا لقمہ لیتے لیتے رک گیا "میں نے تمہیں خالد کے متعلق نہیں بتایا تھا؟"

"نہیں۔"

انور رکا، پھر نوالہ نگلتے ہوئے آہستہ سے بولا "یار! خالد گزر گیا۔"

"اچھا! —— وہ بھی گزر گیا۔" وہ سوچ میں پڑ گیا "یار تم نے کتنوں کے مرنے کی خبر سنائی ہے۔ ان دو برسوں میں اتنے لوگ مر گئے!"

"ان دو برسوں میں لوگ بہت جلدی جلدی مرے ہیں۔"

"اور سب بستر پہ مرے ہیں" جاوید کے لہجے میں ہلکی ہلکی حیرت تھی۔

"کیا؟ —— کیا مطلب؟" انور کچھ چکرا سا گیا۔

"بات یہ ہے کہ وہاں مرنے کا طریقہ دوسرا تھا۔ مرنے کے روایتی طریقوں سے ہم مانوس نہیں رہے تھے۔" رکا، پھر بولا "اسی لیے ہمیں رشید کا مرنا عجیب سا لگا۔"

"رشید؟ رشید مر گیا؟ —— اچھا! —— مگر وہ تو راجشاہی میں تھا۔"

"ہاں راجشاہی میں تھا، مگر آخری دنوں میں وہ وہاں سے بھاگ کر ڈھاکہ آ گیا تھا۔ کچھ دنوں میرے ساتھ رہا —— پھر مر گیا —— مگر بستر پہ لیٹ کر۔"

"اچھا تو رشید مر گیا۔" انور افسوس کے لہجے میں بڑبڑایا۔

"ہاں، مگر ہم نے اسے کفن بھی دیا تھا اور دفن بھی کیا تھا۔"

انور اس کا منہ تکنے لگا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔

"رشید کی موت اُس دیس میں شاید آخری روایتی موت تھی۔" جاوید نے اپنے پہلے بیان کی وضاحت کی اور چپ ہو گیا۔

دونوں تھوڑی دیر تک چپ بیٹھے کھاتے رہے۔ کچھ کھایا کچھ نہ کھایا، پانی پیا، فارغ ہو بیٹھے۔ جاوید نے پھر اردگرد نظر ڈالی۔ بہت سے چہرے بدل گئے تھے۔ مختلف میزوں پہ نئی کڑھائیاں تھیں اور نئے کھانے والے، اور نئے جبڑے کہ اسی طرح حرکت کر رہے تھے اور پھیلتے جا رہے تھے۔ اس نے اس طرف سے نظر پھیری اور پھر انور سے مخاطب ہوا۔

"تم پوچھ رہے تھے کہ میں جب سے یہاں پہنچا ہوں تو میں نے کیا محسوس کیا۔ یہی پوچھ رہے تھے نا؟"

"ہاں۔"

"یار! پہلے تو مجھے یوں لگا کہ یہاں سب کچھ بدل گیا ہے اور مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ پھر رفتہ رفتہ مجھے لگا کہ یہاں تو کچھ بھی نہیں بدلا ہے، اور پھر مجھے ایک دھچکا اور لگا۔"

"ان دونوں تاثرات میں کیا ربط ہے؟" انور سوچ میں پڑ گیا۔

"کوئی ربط نہیں۔ اچھا خیر چھوڑو اس بات کو۔" جاوید نے فوراً مضمون بدلا، "تم کچھ سناؤ؟"

"سنانے کی کوئی بات ہو تو سناؤں۔" اب انور اتنا بجھ گیا تھا کہ کچھ سنانے پہ مائل نہیں تھا۔

"اچھا تم کل کس کا ذکر کر رہے تھے؟"

"کس کا؟ مجھے تو یاد نہیں۔"

"جسے گولی لگی تھی۔"

"اچھا تم مرزا کی بات کر رہے ہو۔"

"مرزا گولی سے مرا تھا؟ گولی اسے کیسے لگی؟"

"ایسا ہوا کہ جلسے سے نکل رہا تھا۔ جلسہ ابھی ختم ہوا تھا۔ سڑک پہ بھیڑ بہت تھی"۔

"ہاں جلسے کے ساتھ یہی تو خرابی ہے کہ اس کے بعد سڑک پہ بھیڑ بہت ہو جاتی ہے۔

اچھا پھر؟"

"پھر بس یہ ہوا کہ اس نے سڑک کو عبور کیا۔ چار قدم چلا تھا کہ کسی نے گولی مار دی وہ مر گیا۔"

"گولی مار دی؟ —— اچھا —— مگر کیوں مار دی؟"

"بس مار دی"۔

"اچھا! —— عجیب بات ہے! —— پھر کیا ہوا؟

"پھر کیا ہوتا"۔

"کچھ بھی نہیں ہوا؟" اس نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ ہونا کیا تھا؟"

"آدمی کو گولی لگ جائے اور پھر کچھ بھی نہیں، عجیب بات ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کیوں انور!"

"تم ٹھیک کہتے ہو اس سے پہلے مجھے یہ احساس ہی نہیں ہوا تھا"۔

"تمہیں یہ احساس ہی نہیں ہوا تھا؟" اس نے حیرت اور دہشت سے انور کو دیکھا۔

"ہاں یار" اس نے ایک شرمندگی کے ساتھ کہا اور پھر تعجب سے جاوید کو دیکھنے لگا

"جاوید!"

"ہاں! کیا بات ہے۔"

"یار!" اس نے ڈرتے ڈرتے ایک بار پھر کریدا "تم نے تو وہاں اس سے بہت زیادہ دیکھا ہوگا کیوں؟"

جاوید نے تامل کیا "ہاں"۔ اس نے افسردہ لہجے میں کہا "تم ٹھیک ہی کہتے ہو —— مگر ہم کو یہ تو پتا تھا کہ کیوں ہو رہا ہے —— اور یہ احساس تو تھا کہ کیا ہو رہا ہے —— "

# ہندوستان سے ایک خط

عزیز از جان سعادت و اقبال نشان برخوردار کامران طول عمرہ بعد دعا اور تمنائے دیدار کے واضح ہو کہ بہ زمانہ خیریت تمہاری نہ معلوم ہونے کی وجہ سے بہت بے چینی میں گزرا۔ میں نے مختلف ذرائع سے خیریت بھیجنے اور خیریت منگانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ ایک چٹھی لکھ کر ابراہیم کے بیٹے یوسف کو بھیجی اور تاکید کی کہ اسے فوراً کراچی کے پتے پر بھیجو اور اُدھر سے جو چٹھی آئے مجھے بواپسی ڈاک روانہ کرو۔ تمہیں پتا ہوگا کہ وہ کویت میں ہے اور اچھی کمائی کر رہا ہے۔ بس اسی میں وہ اپنی اوقات کو بھول گیا اور پلٹ کر لکھا ہی نہیں کہ چٹھی بھیجی یا نہیں بھیجی اور ادھر سے جواب آیا یا نہیں آیا۔ شیخ صدیق حسن خاں کا بیٹا لندن جا رہا ہے تو اسے بھی میں نے ایک خط لکھ کر دیا تھا کہ اسے کراچی کے لیے لفافے میں بند کر کے لندن کے لیٹر بکس میں ڈال دینا۔ اس حرام خور نے بھی کچھ پتا نہ دیا کہ خط اُس نے بھیجا یا نہ بھیجا۔

سب سے زیادہ تشویش عمران میاں کی طرف سے رہی کہ وہ وہاں پہنچے یا نہیں پہنچے۔ پہنچے تو کسی طور تو انہیں اپنی خیریت کا خط بھجوانا تھا۔ احوال یہ ہے کہ عمران میاں ادھر سے گزرے تھے۔

یہ جنگ کے دو سوا دو ماہ بعد کی بات ہے۔ یہ سمجھو کہ وہ گلابی جاڑا تھا۔ میں اپنا پلنگ کمرے سے دالان میں لے آیا تھا۔ رات گئے دستک ہوئی میں پریشان ہوا کہ الٰہی خیر۔ اس غیر وقت میں کون آیا اور کیوں آیا۔ جاکر دروازہ کھولا، دستک دینے والے کو سر سے پیر تک دیکھا۔ حیران و پریشان کہ یہ کون آگیا ہے۔ خون نے خون کو پہچانا ورنہ وہاں اب پہچاننے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ تب میں نے اسے گلے لگایا اور کہا کہ بیٹے ہم نے تمہیں ان حالوں تو پاکستان نہیں بھیجا تھا، تم کیا حال بناکر آئے ہو۔ مگر پھر میں اپنے کہے پر آپ نادم ہوا۔ یہ کیا کم تھا کہ ہماری امانت ہمیں واپس کفہ بن جائے۔ اور کہنے والا مستحق عذاب ٹھہرے۔ انسان ضعیف البنیان نے اس دنیا میں آنے کے بعد وہ کچھ کیا ہے کہ اس کے ساتھ جو بھی ہو اس پر شکایت کی گنجائش نہیں۔ آدمی بس چپ رہے۔ اور جبار و قہار کے قہر سے ڈرتا رہے۔

تمہاری چچی نے عمران میاں کو دیکھا تو حق دق رہ گئیں۔ گلے لگایا اور بہت روئیں۔ میں تو چپ رہا تھا مگر وہ پوچھ بیٹھیں کہ بہو کہاں ہیں۔ بچوں کو کہاں چھوڑا؟ اس پہ اس عزیز کی حالت غیر ہوگئی۔ میں اور تمہاری چچی دونوں گھبرا گئے۔ پھر احتیاط برتی کہ ایسا کوئی حوالہ درمیان میں نہ آئے عمران میاں یہاں تین دن رہے مگر کیا رہے۔ نہ بولنا نہ ہنسنا، بس گم سم۔ تیسرے دن عمران میاں کو خیال آیا کہ میاں جانی کی قبر پہ چلا جائے۔ میں نے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا کہ بیٹے تم پچیس برس بعد دادا کی قبر پر فاتحہ پڑھو گے۔ مگر دن میں اس طرف جانا قرین مصلحت نہیں۔ تم اسی مٹی میں پیدا ہوئے ہو۔ پہچانے جاؤ گے۔ اس پہ وہ عزیز زہر خند ہوا اور بولا کہ چچا جان! میں گھر آنے سے پہلے بستی میں گھوم پھر لیا ہوں۔ اس مٹی نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے کہا کہ بیٹے اب اسی میں عافیت ہے کہ یہ مٹی تمہیں نہ پہچانے۔ خیر تو میں شام پڑے عمران میاں کو قبرستان لے گیا۔ نئی قبروں سے میں نے متعارف کرایا پرانی قبروں کو انہوں نے خود پہچان لیا۔ اندھیرا تھا اس لیے بعض قبروں کی شناخت میں قدرے دقت پیش آئی۔ میاں جانی کی قبر پہ پہنچ کر عمران میاں کا دل بھر آیا۔ میری بھی آنکھ بھیگ گئی۔ وہ قبر اب بہت کہنہ ہوگئی ہے سرہانے کھڑا ہوا ہارسنگھار کا پیڑ گر چکا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ میاں جانی کو ہارسنگھار کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے باغ میں بہت شوق سے کئی پیڑ لگائے تھے اور ان

سے اتنے پھول اترتے تھے کہ سال بھر تک گھر کی بچیوں کے دوپٹے ان میں رنگے جاتے تھے اور ہر دعوت پر بریانی میں ڈالے جاتے تھے، پھر بھی بچ رہتے تھے۔ مگر ہار سنگھار تو بچ جاتا ہے۔ بیں

مل گئی۔ بندے کو چاہیے کہ ہر حال میں شکر خدا کرے۔ حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے کہ سب دا کلمہ اکیلا کس کس چیز پر توجہ دوں۔ ہار سنگھار کا یہ آخری پیڑ تھا جو میاں جانی کے سرہانے کھڑا رہ گیا تھا جنگ سے پہلے والی برسات میں وہ بھی گر گیا۔ اب ہمارا باغ اور ہمارا قبرستان دونوں ہار سنگھار سے خالی ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔ باغ بچارہ گیا تو بھی بہت ہے۔ قبرستان سے متصل ہونے کی بنا پر قبرستان میں شمار ہوا اور ہاتھ سے جاتے جاتے بچ گیا۔ مگر ان تائیں برسوں میں اتنے پیڑ گرے ہیں اور ان کے ساتھ اتنی یادیں دفن ہوگئی ہیں کہ اب اس باغ کو بھی قبرستان سمجھنا چاہیے۔ جو پیڑ باقی رہ گئے ہیں وہ گزرے دنوں کے کتبے نظر آتے ہیں۔ بہر حال جو باغ کا حال ہے وہ عمران میاں دیکھ گئے ہیں۔ اگر پہنچ گئے ہوں گے تو بتایا ہوگا۔ یہاں سے تو وہ اسی صبح کو چلے گئے تھے۔ رات بھر میاں جانی کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر گزار دی۔ میں بھی بیٹھا رہا۔ جب جھٹپٹا ہوا اور چڑیاں بولیں تو وہ عزیز جھرجھری لے کر اٹھا اور مجھ سے رخصت چاہی۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ کیوں جا رہے ہو؟ آ گئے ہو تو رہو۔ پھیکے پن سے بولا کہ یہاں تو مجھے کوئی پہچانتا ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ عزیز اب نہ پہچانے جانے ہی میں عافیت ہے۔ مگر وہ میری بات سے قائل نہیں ہوا۔ سفر اس پر سوار تھا۔ میں نے پوچھا "مگر بیٹے جاؤ گے کہاں؟" بولا کہ جہاں قدم لے جائیں گے۔ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ کھٹمنڈو جا کر وہاں سے کراچی جانے کی صورت نکالنے کی نیت ہے۔ دل تو بہت دکھا مگر کچھ اس کا اصرار اور کچھ میرا یہ ڈر کہ کہیں یہ خبر نہ نکل جائے۔ سو میں نے صبر کیا۔ اپنے بازو سے دعائے نور کھول کر اس کے بازو پہ باندھی اور اللہ کی حفظ و امان میں اسے رخصت کیا۔ چلتے چلتے تاکید کی تھی کہ سرحد سے نکلتے ہی جس طرح بھی ہو خیریت کی اطلاع دینا۔ مگر وہ دن ہے اور آج کا دن، خیریت کی خبر نہیں ملی۔

ادھر کی خبر ادھر کم کم پہنچتی ہے اور پہنچتی بھی ہے تو اس طرح کہ اس پر اعتبار کرنے کو

جی نہیں چاہتا۔ ایک روز شیخ صدیق حسن نے آکر خبر سنائی کہ پاکستان میں سب سوشلسٹ ہو گئے ہیں اور پیاز پانچ روپے سیر بکتے ہیں۔ یہ خبر سن کر دل بیٹھ گیا۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ شیخ صاحب پرانے کانگریسی ہیں۔ پاکستان کے بارے میں جو خبر سنائیں گے ایسی ہی سنائیں گے۔ ان کے بیان پر اعتبار نہ چاہیے۔ چند ہی دنوں بعد ایک ایسی خبر سن لی جس سے بری افواہوں کی تردید ہو گئی؟ خبر سنی کہ مرزائیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ شیخ صاحب کو میں نے یہ خبر سنائی تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان پر اپنی رحمت کرے اور اس قوم کو اس کی نیکی کی جزا دے ہم تو کفرستان میں ہیں۔ غیر اسلامی رسوم واطوار رکھتے ہیں اور بول نہیں سکتے۔ ہماری حویلی سے قریب ہی غیر مقلدوں نے اپنی مسجد بنالی ہے۔ وہاں وہ بلند آواز سے آمین کہتے ہیں اور ہم چپ رہتے ہیں۔

ہاں شیخ صدیق حسن تمہارے متعلق بھی ایک مرتبہ خبر لائے تھے۔ خبر سنائی کہ تم نے کوٹھی بنوائی ہے۔ بیٹھک میں صوفے بچھے ہوئے ہیں اور ٹیلی ویژن رکھا ہے۔ یہ خبر سن کر خوشی ہوئی۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ یہاں کی تلافی وہاں ہو گئی ہے۔ یہاں حویلی کا حال اچھا نہیں ہے۔ پچھلی برسات میں بھیگی ہوئی کڑیاں اور جھک گئیں۔ دیوان خانے کا حال تو یہ ہے کہ چھت کی طرف دیکھو تو آسمان نظر آتا ہے۔ ہماری بیکاری اور زیر باری کا حال تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ تم کچھ رقم بھیج سکو تو میاں جانی کی قبر کی مرمت کرا دی جائے اور دیوان خانے کی چھت پہ مٹی ڈلوا دی جائے۔ اس سے زیادہ فی الحال کرنا بھی نہیں چاہیے۔ حویلی کے مقدمے کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا۔ قبلہ بھائی صاحب مرحوم ۱۹۴۷ء میں جاتے وقت مقدمے کے کاغذات میرے سپرد کر گئے تھے۔ الحمد اللہ کہ اس وقت سے اب تک میں نے سب پیشیاں کامیابی سے بھگتائی ہیں اور ہمیشہ لائق وکیلوں سے رجوع کیا ہے۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ مقدمے کا فیصلہ جلدی ہو گا اور ہمارے حق میں ہو گا۔ مگر پیک اجل کا پتا نہیں کہ کس روز سر پہ آکھڑا ہو۔ کبھی کبھی بہت فکر مند ہوتا ہوں کہ میرے بعد یہ مقدمہ کون لڑے گا۔

جس طرف نظر ڈالتا ہوں، تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ ہمارے صاحب زادے اختر کے لچھن یہ ہیں کہ اپنا نام پرپمی رکھ لیا ہے اور ریڈیو پہ جا کر ڈراموں میں پارٹ ادا کرتا ہے۔ چھوٹے بھیا مرحوم کی صاحب زادی خالدہ نے ایک ہندو وکیل سے شادی کر لی ہے۔ اب وہ لیے حجابی سے ساڑھی باندھتی ہے اور ماتھے پہ بندی لگاتی ہے۔ پاکستان میں جو خاندان کا نقشہ ہے وہ کم پر مجھ سے زیادہ روشن ہونا چاہیئے۔ سنا تھا کہ آپا جانی کی لڑکی نرگس نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے اور جس سے کی ہے وہ وہابی ہے۔ خود آپا جانی کا احوال میں نے یہ سنا ہے کہ وہ کھلے منہ بیٹے کی موٹر میں بیٹھتی ہیں اور بزازوں سے منہ در منہ بات کر کے کپڑا خریدتی ہیں۔

یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے ایک میں ہی زندہ رہ گیا ہوں۔ قبلہ بھائی صاحب مرحوم اور چھوٹے بھیا دونوں اچھے دنوں میں سدھار گئے۔ جب میں قبرستان جاتا ہوں اور میاں جانی اور چھوٹے بھیا کی قبروں پر فاتحہ پڑھتا ہوں تو قبلہ بھائی صاحب بہت یاد آتے ہیں۔ کیا وقت آیا ہے کہ اب ہم میں سے کوئی جا کر ان کی قبر پہ فاتحہ بھی نہیں پڑھ سکتا۔ جو خاندان ایک جگہ جیا ایک جگہ مرا اب اس کی قبریں تین قبرستانوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ میں نے قبلہ بھائی صاحب سے مودبانہ عرض کیا تھا کہ اگر آپ ہمیں چھوڑ رہے ہیں تو پھر مناسب یہ ہے کہ آپ کامران میاں کے پاس کراچی جائیے۔ مگر چھوٹے بیٹے کی محبت انھیں ڈھاکہ لے گئی۔ ان کی بے وقت موت ہم سب کے لیے بہت بڑا صدمہ تھی۔ مگر اب میں سوچتا ہوں کہ ان کے جلدی اٹھ جانے میں بھی اللہ تعالیٰ کی مصلحت تھی۔ وہ نیک روح تھے۔ قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ عسرت و اذیت کے دن دیکھنے کے لیے زندہ رہیں۔ یہ دن تو مجھ گنہ گار کو دیکھنے تھے۔

اب جبکہ بڑوں کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے اور ہمارا خاندان ہندوستان اور پاکستان اور بنگلہ دیش میں بٹ کر بکھر گیا ہے اور میں لب گور بیٹھا ہوں سوچتا ہوں کہ میرے پاس جو امانت ہے اسے تم تک منتقل کر دوں کہ اب تم ہی اس خاندان کے بڑے ہو۔ مگر اب یہ امانت حافظے کے واسطے ہی سے منتقل کی جا سکتی ہے۔ خاندان کی یادگاریں مع شجرۂ نسب کے قبلہ بھائی صاحب

اپنے ہمراہ ڈھاکہ لے گئے تھے۔ جہاں افرادِ خاندان ضائع ہوئے وہاں وہ یادگاریں بھی ضائع ہوگئیں۔ عمران میاں یہاں بالکل خالی ہاتھ آئے تھے۔ سب سے بڑا سانحہ یہ ہوا کہ ہمارا شجرۂ نسب گم ہوگیا۔ ہمارے اجداد نے کہ سادات عظام میں سے تھے۔ تاریخ میں بہت مصائب و آلام دیکھتے ہیں، مگر شجرے کے گم ہونے کا الم ہمیں سہنا تھا۔ اب ہم ایک آفت زدہ خاندان ہیں جو اپنا ٹھکانا اور شجرہ گم کرچکا ہے اور انتشار کا شکار ہے۔ کوئی ہندوستان میں کھیت ہوا، کوئی بنگلہ دیش میں گم ہوا اور کوئی پاکستان میں دربدر پھرتا ہے۔ عقیدے میں خلل پڑچکا ہے۔ غیر اسلامی طور اطوار اپنا لیے ہیں۔ دوسرے مذہبوں اور فرقوں میں شادیاں کر رہے ہیں۔ یہی حال رہا تو تھوڑے عرصے میں ہمارے خاندان کی اصل نسل بالکل ہی نابود ہو جائے گا اور کوئی یہ بتانے والا بھی نہ رہے گا کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں۔

سوائے فرزند! اس کہ ہم نجیب الطرفین سید ہیں۔ حضرت امام موسیٰ کاظم سے ہمارا سلسلۂ نسب ملتا ہے۔ مگر الحمدللہ کہ ہم رافضی نہیں ہیں۔ صحیح العقیدہ حنفی مسلمان ہیں۔ اصحاب کبار کو مانتے ہیں اور اہلبیت سے محبت رکھنے میں میاں جانی کا طریق چلا آتا تھا کہ عاشور کے دن روزہ رکھتے اور دن بھر مصلے پہ بیٹھے رہتے۔ ہمارے گھر میں ایک تسبیح تھی کہ عاشور کے دن عصر کے ہنگام سرخ ہوجایا کرتی تھی۔ میاں جانی بتاتے تھے کہ یہ خاص اُس مقام کی مٹی کے دانے ہیں جہاں ہمارے جدالجد سیدنا حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام گھوڑے سے فرش زمین پر آئے تھے۔ اس تسبیح کے سرخ ہونے کے ساتھ والدِ مرحوم کا استغراق بڑھ جاتا۔ مگر سینہ کوبی اور گریہ سے اجتناب کرتے تھے کہ یہ بدعت ہے۔ ہاں کھچڑے کی دیگیں پکتی تھیں جو غربا و مساکین میں تقسیم ہوتی تھیں۔ تقسیم کے بعد بس ایک دیگ رہ گئی تھی۔ پچھلے برس ہم اس ایک دیگ سے بھی گئے۔ نیولی کا دیگچا پکوایا اور غربا میں بانٹ دیا۔ اگلے برس کا حال اللہ کو معلوم ہے۔ مہنگائی بڑھتی چلی جارہی ہے اور ہمارا حال خستہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ بیٹے! ہمیں یہ تو معلوم ہے۔ کہ پاکستان میں پیاز اب کس بھاؤ بک رہی ہے، مگر ایک بات سن لو قیمتیں

بڑھ کر گرا نہیں کرتیں اور اخلاق گر کر سنبھلا نہیں کرتے۔ پس پناہ مانگو اُس وقت سے جب
چیزوں کی قیمتیں چڑھنے لگیں اور لوگوں کے اخلاق گرنے لگیں۔ جب ایسا وقت آجائے
تو بندوں کو چاہیے۔ کہ توبہ و استغفار کریں اور تلاوت کلام پاک کریں کہ عاد و ثمود کی بستیوں
کے ذکر میں فہم رکھنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

خیر میں ذکر اپنے خاندان کا کر رہا تھا۔ اُس خاندان کا جسے میں نے اکٹھا بھی دیکھا مگر
بکھرتے ہوئے زیادہ دیکھا۔ بیان کیا ہم تینوں بھائیوں سے اپنے حضور بٹھا کر میاں جانی
نے کہ خدا ان کی قبر کو ہار سنگھار کی سوگندھ سے بسائے رکھے۔ وہ فرماتے تھے کہ مجھ سے بیان
کیا میرے والد بزرگوار سید حاتم علی نے اُس وقت جب کہ ان کا وقت سفر قریب آیا۔ فرمایا
اُس جناب نے کہ مجھ سے بیان کیا میرے باپ سید رستم علی نے اُس تذکرے کے حوالے
سے کہ جس میں ہمارے خاندانی حالات تمام و کمال درج تھے اور جو ضائع ہو گیا اُس ہنگام جبکہ
انہوں نے سنہ ستاون میں بائیس خواجہ کی چوکھٹ کو چھوڑا اور برس برس خاک بسر دربدر پھرے
اور حوالے سے ان بزرگوں کے بیان کرتا ہوں میں تم سے کہ ہم اصل میں اصفہان کی مٹی ہیں۔
جب آوارہ وطن شہنشاہ ہمایوں نے اپنی سلطنت کے حصول کے لیے اس دیار میں اپنا لشکر
آراستہ کیا تو ہمارے مورث اعلیٰ میر منصور محدث کہ خرما فروش تھے اور علم الحدیث کا بحر
بیکراں تھے۔ اصفہان نصف جہاں سے اُس فلک جناب کے ہم رکاب ہوئے اور ظلمت
کدہ ہند میں پہنچ کر مینارہ نور ایمان بنے۔ اکبر آباد میں ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق ہے۔
قبر کچی ہے۔ کنواریاں مٹی اٹھا کر مانگ میں ڈالتی ہیں جو برس کے اندر اندر مانگ کا سیندور
بن جاتی ہے۔ خالی گود بیبیاں مٹی آنچل میں باندھ کر لے جاتی ہیں اور برس بعد ہری گود کے
ساتھ واپس آتی ہیں اور چادر چڑھاتی ہیں۔ شاہجہاں کے وقت میں اس بزرگ کی اولاد
نے اکبر آباد سے رخت سفر باندھا اور جہاں آباد پہنچی۔ پھر وہاں سے سنہ ستاون کی رستاخیز
میں نکلی۔ ہمارے جد میر رستم علی نے اپنی دولت میں سے دمڑی ساتھ نہ لی۔ بس شجرہ نسب

کو پٹکے کے ساتھ کمر پر مضبوط باندھا، کاغذات و دستاویزات کا پلندہ بغل میں دبایا اور نکل کھڑے ہوئے اسی پلندے میں خاندان کا تذکرہ بھی تھا۔ راہ میں بٹ ماروں سے مقابلہ ہوا۔ اس افراتفری میں پلندہ بکھر گیا۔ کچھ کاغذات گر گئے، کچھ رہ گئے۔ گر جانے والے کاغذوں میں تذکرہ بھی تھا۔ مگر شکر صد شکر کہ شجرے کا حرف بھی میلا نہ ہوا۔

بہت خاک چھاننے کے بعد اس بستی سے کہ یہاں اب اکیلا تمہارا اچھا خاک نشین ہے، گزر ہوا۔ یہاں کی زمین کو مہربان پا کر ڈیرا کیا۔ جاننا چاہیے کہ زمین جب مہربان ہوتی ہے تو محبوبہ کی آغوش کی طرح نرم اور ماں کی گود کے سمان کشادہ ہو جاتی ہے جب نامہربان ہوتی ہے تو جابر حاکم کی مثال سخت اور حاسد کے دل کی مانند تنگ ہو جاتی ہے حق یہ ہے کہ اس زمین نے ایک مدت تک ہم پہ دیا کی اس نے ہمارے بڑھتے پھیلتے خاندان کو برس برس تک اس طرح اپنی آغوش میں سمیٹے رکھا جیسے تصرف پسند ماں بچوں کو سینے سے لگائے رکھتی ہے اور کسی کو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ تقسیم سے پہلے اس خاندان کے صرف تین فرد باہر نکلے تھے۔ بھائی اشرف علی بھیا فاروقی اور پیارے میاں۔ بھائی اشرف علی ہمارے چچا جانی کے بیٹے تھے اور عمر میں قبلہ بھائی صاحب سے ایک سال بڑے تھے۔ اس اعتبار سے تمہارے تایا ہوئے مانتے اللہ سے ڈپٹی کلکٹر تھے اور باہر کے اضلاع میں تعینات رہتے تھے۔ مگر ڈالی یہیں پہنچتی تھی۔ بھیا فاروقی ان کے چھوٹے بھائی تھے اور میرے ہم عمر تھے۔ محکمۂ جنگلات میں تھے۔ عمر سی۔ پی میں گزری۔ ہماری حویلی میں لکڑی کا جتنا سامان تم نے دیکھا وہ انہی کا بنوایا اور بھجوایا ہوا تھا۔ دونوں بھائی فخرِ خاندان تھے۔ عمر باہر گزاری مگر آخر میں آرام اپنی مٹی میں آ کر کیا۔

پیارے میاں پھوپھی اماں کے لاڈلے بیٹے تھے۔ لاڈ پیار میں ایسے بگڑے کہ ساتوں عیب کرنے لگے۔ ہمارے خاندان میں وہ پہلے فرد تھے جنھوں نے بائیسکوپ دیکھا۔ ایک دفعہ میں بھی ان کے کہنے میں آ کر بہک گیا۔ مادھوری کو دیکھ کر دل سخت بے قابو ہوا۔ مگر میں نے اپنے

آپ کو سنبھالا اور پھر اُس طرف کا رخ نہیں کیا۔ پیارے میاں آ گئے ناٹک کے متوالے تھے، بائیسکوپ شہر میں آیا تو اس کے رسیا بن گئے۔

"بمبئی کی بلی" دیکھ کر سلوچنا پر مرمٹے۔ ایک روز پھوپھی اماں کی سونے کی بالیاں چرا کر گھر سے نکل گئے اور سیدھے بمبئی پہنچے۔ میاں جانی نے کہلا بھیجا کہ صاحب زادے اب ادھر کا رخ نہ کرنا۔ بمبئی میں ایک نٹنی نے انھیں جھانسا دیا کہ تمھیں سلوچنا سے ملاؤں گی۔ سلوچنا سے تو نہ ملایا خود گلے پڑ گئی۔ ساری جوانی بمبئی میں گزاری۔ پھوپھی اماں کے مرنے کی خبر پہنچی تو آئے۔ بڑھاپا آ چکا تھا۔ لمبی سفید ڈاڑھی۔ ہاتھ میں تسبیح ماں کو بہت روئے۔ ہم سب نے کہا کہ اب تم یہیں رہو۔ بولے کہ میاں جانی کی اجازت کے بغیر یہاں کیسے ٹک سکتا ہوں۔ میاں جانی دنیا سے پہلے ہی سدھار چکے تھے، اجازت کون دیتا۔ پھر بمبئی چلے۔ ۴۷ء لگ چکا تھا اور گاڑیوں میں حادثے ہو رہے تھے۔ سب نے بہت سمجھایا، نہ مانے۔ گاڑی میں سوار ہو گئے، مگر بمبئی تو پہنچے نہیں۔ جانے راستے میں ان پر کیا گزری۔

پیارے میاں ہمارے خاندان کی طرف سے ۴۷ء کے فسادات میں پہلی کھیپ تھے میں نے اعداد و شمار جمع کیے ہیں۔ تب سے اب تک ہمارے خاندان کے اکتیس افرادِ اللہ کو پیارے ہوئے اکیس مقتول ہوئے۔ تو طبعی موت مرے سات کو ہندوؤں نے ہندوستان میں شہید کیا۔ چودہ پاکستان جا کر برادران اسلام کے ہاتھوں اللہ کو عزیز ہوئے۔ ان چودہ میں سے ایک کو کراچی میں ایوب خاں کے آدمیوں نے الیکشن کے موقع پر محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کرنے کی پاداش میں گولی مار دی۔ باقی دس افرادِ مشرقی پاکستان میں ہلاک ہوئے۔ ان افراد میں میں نے عمران میاں کو شمار نہیں کیا ہے۔ بندے کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ ہمارے جگر کا ٹکڑا اگر ابھی تک کراچی نہیں پہنچا ہے تو کھٹمنڈو میں ہے کھٹمنڈو سے یاد آیا کہ بھیا فاروق کا لڑکا شرافت بھی یہاں سے گزرا تھا۔ ڈھاکہ سے بچ نکلا تھا اور کھٹمنڈو جا رہا تھا کہ راستے میں یہاں رک گیا۔ وہ بنا بنایا پیارے میاں ہے۔ اس سانحے نے اس پر ذرا جو

اثر کیا ہو۔ جتنے دن یہاں رہا ہے، بے دھڑک بائیسکوپ دیکھتا رہا۔ چلنے کے لیے تیار ہوا تو کھٹمنڈو کی بجائے بمبئی کے لیے بستر باندھا۔ میں نے بمبئی جانے کا سبب پوچھا تو کہا کہ وہاں راجیش کھنہ سے ملوں گا۔ میں نے کہا کہ ارے بے ایمان! راجیش کھنہ کون سا ای بلمور یا ڈی بلمور یا ہے جو تو اس سے ملنے کے لیے بیتاب ہے۔ مگر اس نے میری ایک کان سنی اور دوسرے کان اڑائی اور بمبئی روانہ ہو گیا۔ بعد میں اس کا لنکا سے خیریت کا خط آیا۔ پتا نہیں کن کن راستوں پر بھٹک کر وہ وہاں پہنچا۔

شرافت کو زندہ دیکھ کر خدا کا شکریہ ادا کیا، مگر اس کے لچھن دیکھ کر دل خوش نہیں ہوا۔ ویسے میں نے جو کچھ سنا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں جا کر ہمارے خاندان کی لڑکیاں زیادہ آزاد ہو گئی ہیں۔ میں تو جس لڑکی کے متعلق سنتا ہوں یہی سنتا ہوں کہ اس نے اپنی مرضی سے شادی کر لی ہے۔ ہمارے خاندان میں تقسیم سے پہلے بس ایک واقعہ ایسا ہوا تھا جو خاندان کو بدنام کر سکتا تھا، مگر اسے بھی خوش اسلوبی سے دبا دیا گیا۔ چھوٹی پھوپھی کی چھت پہ ایک روز کنکوا آ کے گرا ——— اور تم جانو کہ جس گھر میں کوئی لڑکی جوان ہو رہی ہو اس گھر کی انگنائی میں روڑے کا گرنا اور چھت پر کنکوے کا خم کھانا کچھ اچھی علامت نہیں ہے ———

اُن دنوں چھوٹی پھوپھی کی بڑی لڑکی خدیجہ قد نکال رہی تھی۔ چھوٹی پھوپھی نے اس واقعے کا ذکر میاں جانی سے آ کر کیا۔ کنکوے کے ساتھ جو رقعہ چھت پر گرا تھا وہ بھی سامنے رکھ دیا۔ میاں جانی آگ بگولا ہو گئے۔ بہت گرجے برسے کہ رضا علی کے بیٹے کی یہ مجال کہ ہماری چھت پہ کنکوا گراتا ہے۔ مگر جب چھوٹی پھوپھی نے اونچ نیچ سمجھائی تو نیچے پڑے۔ اب اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا کہ اس اوباش کے ساتھ دو بول پڑھائے جائیں اور لڑکی کو رخصت کر دیا جائے رضا علی صاحب تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اس گھر کی بیٹی ان کی بہو بنے گی۔ ترت نکاح پہ رضامند ہو گئے مگر عین وقت پہ سوال اٹھایا کہ صیغہ پڑھا جائے گا۔ میاں جانی خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے مگر کیا کرتے، ہاں کر دی۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہی کہ خدیجہ کی اولاد آدھی تیتر آدھی بٹیر

ہے۔ ایک گیارہویں شریف کی نیاز دلاتا ہے تو دوسرا محرم میں عزاداری کرتا ہے۔ مگر خیر اب تو ہمارا پورا خاندان ہی آدھا تیتر آدھا بٹیر ہے اور ہم سب عزادار ہیں کہ شجرہ ہمارا کھویا گیا اور اصل نسل کا اتا پتا غارت ہوا۔ خاندانوں میں یہ خاندان آگے کیسے پہچانا جائے گا۔ اب یہ خاندان کاہے کو ہے، درخت سے جھڑے ہوئے پتے ہیں کہ ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں اور خاک میں رلتے ملتے ہیں۔

عزیزا اب میں اڑتے پتوں کا ماتم دار ہوں۔ اُن دنوں کو، جب یہ خاندان برگ وثمر سے لدا پھندا درخت تھا، یاد کرتا ہوں اور آوارہ پتوں کا شمار کرتا ہوں۔ میں نے مرنے والوں ہی کے اعداد و شمار جمع نہیں کیے ہیں۔ جن کا زندوں میں شمار ہے ان کو بھی شمار کیا ہے۔ سب کے نام، پتے اور کوائف قلم بند کیے ہیں۔ تحقیق کی ہے کہ اس وقت کون اہلِ خاندان کس ملک میں آوارہ ہے اور کس نگر میں خاک بسر ہے۔ یہ عبرت بھرا چٹھا میں تمہیں بھیج دوں گا۔ اپنا کیا اعتبار کہ چراغ سحری ہیں۔ چراغ بجھا چاہتا ہے، اور آنکھ بند ہوا چاہتی ہے۔ تم اس سیہ بخت خاندان کے نئے چشم و چراغ ہو۔ اندھیرے میں بھٹکنے ہوؤں کو اگر تم اجالے میں لانے کی سعی کرو تو یہ تمہاری سعادت مندی ہو گی۔ ویسے تو مشاہدے میں یہی آیا ہے کہ تنکے بکھر گئے سو بکھر گئے۔ تتر بتر خاندان کبھی سمٹتے نہیں دیکھے گئے۔ مگر کوشش کرنا انسان کا فرض ہے اس درماندہ خاندان کے سر وہرے بنو۔ آواروں کی خیر خبر رکھو۔ اب کہ رستے کھلنے لگے ہیں، ادھر کا بھی ایک پھیرا لگا جاؤ۔ اپنی صورت دکھا جاؤ، ہماری صورت دیکھ جاؤ۔ تمہاری چچی کا تقاضا ہے کہ دلہن کو ساتھ لے کر آؤ۔ ہاں میاں اکیلے مت چلے آنا۔ اس بہانے تمہارے بچوں کو بھی دیکھ لیں گے کہ کس کی کیا شکل وصورت ہے؟ کون گورا ہے، کون کالا ہے؟ ایک بات اور، پاکستان جا کر اس خاندان میں جو اضافہ ہوا ہے، اس کی تفصیل میں نے ناموں کی حد تک قلم بند کی ہے۔ شکل وصورت کے کوائف درج نہیں کیے جا سکتے۔

یہ خانہ تم خود پر کر لینا۔ اس ڈھائی پونے تین سال کے عرصے میں جو خاندان میں کمی بیشی ہوئی اس کا اندراج بھی ضروری ہے۔ تم ایسا کرو کہ اس عرصے میں ادھر جو گزر گئے اور جو تازہ وارد ہوئے

ان کی تفصیل معلوم کر کے مجھے لکھو۔ میں الگ الگ کہاں خط لکھوں۔ ڈاک کھلی تو ہے مگر اتنی مہنگی کہ اب حقیر سا پوسٹ کارڈ لکھتے ہوئے بھی یہ لگتا ہے کہ تار برقی بھیج رہے ہیں۔ یہ کیا سن رہا ہوں کہ خدیجہ کی چھوٹی بیٹی نے شوہر سے خلع لے لیا ہے اور خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر میں بھرتی ہو گئی ہے۔ خود تو کام سے گئی، دوسروں کے وظیفہ زوجیت میں کھنڈت ڈالتی پھرتی ہے۔

ہاں میاں! شجرہ تو کھویا گیا، اب یہ خاندان جو بھی کرے تھوڑا ہے۔ مگر سنتا ہوں کہ دوسرے خاندانوں والے اس سے بڑھ کر کر رہے ہیں۔ کوئی بتا رہا تھا کہ ابراہیم نے آٹے میں چوری اور چری پیس پیس کر ایک اور مل بنالی ہے! اور میاں فیض الدین نے کہ یہاں پھٹے حالوں پھرتے تھے، کالے پیسے سے کوٹھیاں کھڑی کر لی ہیں! میں پوچھتا ہوں کہ کیا پاکستان میں سب ہی خاندانوں کے شجرے کھو گئے؟ عجیب ثم العجب کہ ہم نے دیار ہند میں صدیاں بسر کیں۔ عیش کا زمانہ بھی گزارا، ادبار کے دن بھی دیکھے۔ اُس کی شان کے قربان، حکومتیں بھی کیں۔ محکوم بھی رہے مگر شجرہ ہر حال میں حرز جان رہا۔ یہ اُدھر لوگوں نے پاؤ صدی میں اپنے شجرے گم کر دیے۔ خیر خوش رہیں۔

کیا کیا لکھوں، لکھنے کو بہت ہے مگر تم اس کم لکھے کو بہت جانو۔ اپنی خیریت بھیجو۔ آنے کی اطلاع دو۔ رقعہ تمام کرتا ہوں کہ اب نماز کا وقت ہو رہا ہے اور اس کے بعد مقدمے کے کاغذات ترتیب دینے ہیں، کل سہ پہر پیشی ہے۔ یہ چار سو ستائیسویں پیشی ہے۔ انشاء اللہ العزیز خوش اسلوبی سے بھگتا دی جائے گی۔ شاید میں انہی پیشیوں کے لیے زندہ ہوں ورنہ اب تمہارے بوڑھے چچا میں کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ جینے کی خواہش بھی باقی نہیں۔ دنیا میں اگر بہت کچھ دیکھا۔ جو نہ دیکھنا تھا وہ بھی دیکھا۔ کہیں جلدی آنکھ بند ہو کہ وہ دیکھیں جو دیکھنے کی مدت العمر سے آرزو ہے۔

تمہارا دور افتادہ چچا

گمنام قربان علی

مورخہ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۹۴ھ

مطابق ۱۵ / اکتوبر ۱۹۷۴ء

# نیند

ظفر اسے دیکھ کر حیران رہ گیا "ارے سلمان تم؟ تم آ گئے؟ مگر کیسے؟"

"یہ مت پوچھو کہ کیسے۔ بس میں آ گیا۔"

ظفر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگے کیا کہے "وہاں سے زندہ بچ کر نکل آنا ..... یہ تو معجزہ ہے۔"

"ہاں معجزہ ہی سمجھ۔ بس زندگی تھی کہ نکل آیا۔"

تعجب اس کے نکل آنے پر ظفر ہی کو نہیں تھا۔ خود اسے بھی تھا۔ "میں خود حیران ہوں کہ وہاں سے میں کیسے نکل آیا۔"

ظفر حیران اسے تکتا رہا۔ وہاں سے بچ کر نکل آنے والوں میں وہ پہلا شخص تھا جس سے ظفر کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے تصور میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہاں سے کوئی بچ کر کیسے آ سکتا ہے۔ اس سلمان کو ایک مرتبہ نظر بھر کر سر سے پیر تک دیکھا۔ "سلمان! تم وہاں سے نکلے کیسے۔"

"میں کیسے نکلا۔" وہ بڑبڑایا۔ اور اس کا جی چاہا کہ وہ ایک سانس میں اپنی پوری روداد سنا

ڈالے۔ مگر پھر اردگرد کی فضا کو دیکھ کر رکا۔ "یار دو لفظوں میں تو اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو پوری داستان ہے۔ تم سنو گے تو تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔"

"ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے تو سن کر ہوش اڑے جا رہے ہیں۔ اور تم نے تو سب کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے"۔

اس نے ٹھنڈا سانس بھرا "ہاں سب کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے"۔

اذیت بھرے ان گنت منظر اس کی آنکھوں میں گھوم گئے۔ "اتنا کچھ دیکھا ہے کہ...... بس بہت کچھ دیکھا ہے؟"

"پھر سناؤ"

اس کا ایک دفعہ پھر جی چاہا کہ بس شروع ہو جائے۔ لیکن اس نے پھر اپنے آپ کو روکا۔ "سنانے کے لیے میرے پاس بہت کچھ ہے۔ مگر یہاں کھڑے کھڑے کیا سناؤں"

ظفر نے سوچا، پھر پوچھا۔ "شام کو تم کیا کر رہے ہو"؟

"کیا شام کیا صبح، میرے لیے کرنے کو اب ہے کیا"۔

"پھر تم شام کو میری طرف آ جاؤ"

"آ جاؤں گا"۔

"اسلم کو فون کر دونگا۔ وہ بھی آ جائے گا"۔

"اسلم چھکی؟ ارے وہ یہیں ہے"۔

"اسے رزق نہ موت اسے کہاں جانا ہے"۔

"اور زبیدی کہاں ہے"

"اچھا اس کمو ائے کو بھی بلا لوں گا۔ پھر کچی رہی؟"

"پکی"

ظفر نے گھر پہنچ کر تیزی سے ڈائل گھمایا "ہیلو اسلم۔ یار میں ہوں ظفر۔ یار سلمان آ گیا ہے"۔

"سلمان؟...... یار کیا کہہ رہا ہے"؟

"ہاں ہاں یار ۔ وہ آ گیا ہے"؟

"وہ وہاں سے بچ کر نکل آیا؟ مگر کیسے"؟

"شام کو آؤ اور اس سے خود پوچھ لو"۔

"آؤں گا"

پھر اس نے زبیدی کے دفتر فون کیا" ہیلو زیدی۔ بھئی زیدی صاحب کو بلائیں۔۔

۔۔۔ ہیلو زیدی۔۔۔۔۔۔۔ میں ظفر۔ یار تمہیں ایک خبر سناؤں"۔۔۔

"سناؤ"۔

"سلمان آ گیا ہے"۔

"سلمان ـــــــــ نہیں بے"۔

"ہاں یار وہ نکل آیا ہے"

بہت موٹی کھال کا نکلا۔ پھر کہاں ہے وہ"۔

شام کو میری طرف آجاؤ۔ وہ آئے گا"۔

"آجاؤں گا"

شام کو چاروں یار اکٹھے ہوئے۔ تینوں نے سلمان کو اور سلمان نے ان تینوں کو ایک حیرت سے دیکھا۔ اسلم نے اس کے بچ آنے پر پہلے اظہار تعجب کیا، پھر وہاں کے حالات پر اظہار افسوس کیا۔ پھر اُسے غصہ آتا چلا گیا" لوگوں کو انہوں نے کیسی کیسی اذیتیں دے کر مارا ہے ـــ بوڑھوں کو، بچوں کو، عورتوں کو ـــــ وحشی ـــ درندے ـــــ ببر الیس

چلے تو ہیں انہیں ـــــــ" اس نے دانت کچکچائے

"انہیں یہی کرنا چاہیئے تھا"۔ زبیدی نے اعلان کیا۔

"یہی کرنا چاہیئے تھا"؟ اسلم غصہ سے بولا۔

"ہاں ہم پچیس سال تک ان کے ساتھ جو کچھ کرتے رہے تھے اس کے بعد یہی ہی

کرنا چاہیئے تھا"۔

"کیا کرتے رہے تھے۔ کیا کیا تھا ہم نے ان کے ساتھ" اسلم غصہ سے چلایا۔

پھر اسلم نے اخباری رپورٹوں کے حوالے سے ان کے مظالم کی تفصیلات سنائیں اور زیدی نے بے تحاشہ اعداد و شمار بیان کر کے اپنی طرف والوں کے استحصال کو ثابت کیا۔ سلمان نے ایک لمبی جمائی لی۔ ظفر نے اس کی طرف دیکھا۔

"سلمان تمہارا کیا خیال ہے۔ تم بتاؤ"۔

اسلم نے ظفر کے منہ کی بات لپک لی۔ "ہاں سلمان سے پوچھو۔ یہ تو وہاں اتنے عرصے رہا ہے۔ اس نے سارے حالات دیکھے ہیں۔ سلمان تمہارا کیا خیال ہے"

"میرا کیا خیال ہے" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

اسے خاموش دیکھ کر ظفر آخر بے چین ہوا۔ اسے ٹہوکا۔ "یار کچھ بولو"

"کیا بولوں"۔

زیدی طنزیہ ہنسی ہنسا "کرمٹ منٹ سے ڈر رہا ہے"

"کرمٹ منٹ"۔ وہ زیدی کا منہ تکنے لگا۔

اسلم نے زور دے کر کہا "آخر پتہ تو چلے کہ تم اس بارے میں کیا سوچتے ہو"۔

اس نے اک تذبذب کے ساتھ کہا "یار کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔

ظفر نے برہمی سے اسے دیکھا "پچھلے برس جب تم آئے تھے تو تم نے وہاں کے حالات کا تجزیہ کر کر کے میرا دماغ چاٹ لیا تھا۔

وہ ظفر کو تکنے لگا۔ پھر مری ہوئی آواز میں بولا "اس وقت میرا گمان یہی تھا کہ میں نے حالات کو سمجھ لیا ہے"۔

"اچھا چھوڑو اس قصے کو"۔ ظفر نے کہا "تم یہ بتاؤ کہ وہاں ہوا کیا"۔

"ہاں یہ میں بتا سکتا ہوں"۔ اس نے مستعدی سے کہا۔

"میں نے وہاں بہت کچھ دیکھا ہے۔ میں اسے سناؤں تو تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے"۔ وہ یہ کہہ کر ایسے چپ ہوا جیسے کوئی لمبی داستان سنانے کی تیاری کر رہا ہے۔ تینوں یار ہمہ تن گوش ہو بیٹھے۔ انتظار کرتے رہے کہ اب شروع ہوا اور اب شروع ہو۔ مگر وہ بالکل چپ تھا۔ جب وہ کچھ نہ بولا تو ظفر نے ٹہوکا "یار تم تو چپ ہو گئے"۔

"ہاں یار"۔ اس نے سُستائے لہجہ میں کہا "کچھ یاد نہیں آ رہا"۔

اسلم اور زبیری دونوں نے اسے غصیلی نظروں سے دیکھا اور پھر اس سے بے تعلق ہو کر ایک دوسرے سے بحث کرنے لگے۔

بحث گرم ہوتی چلی گئی۔ طنز و تعریض، غصہ، ناشائستہ کلمہ، کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے بیچ بیچ میں ظفر کی طرف سے کوئی بھرپور گالی کبھی اس طرف والوں کے لیے کبھی اس طرف والوں کے لیے وہ ستار ہا دوستوں کا منہ تکتا رہا۔ پھر اس کے پپوٹے بھاری ہونے لگے۔ ایک دو دفعہ اونگھ گیا۔ پھر فوراً ہی وہ مستعد ہو بیٹھا اور ایک ایک بات غور سے سننے لگا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اس کے پپوٹے پھر بھاری ہوئے۔ اور اس کی آنکھیں مندتی چلی گئیں۔

اس نے بیچ میں ایک مرتبہ چونک کر آنکھیں کھولیں۔

"حرامزادے۔ سامراجی کتے"۔ —— اسلم نے زور سے میز پر مکا مارا

"سب سالے غدار تھے۔ ہندوستان کے ایجنٹ"۔ زبیری نے غصے سے کہا سلمان نے دونوں کو نیند بھری نظروں سے دیکھا اور پھر سو گیا۔

آخر وہ اس وقت اٹھا جب چائے سامنے آ گئی اور ظفر نے اسے ٹہوکا "سلمان چائے پیو"۔

اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ معذرت طلب نظروں سے دوستوں کو دیکھا اور مستعد ہو بیٹھا۔ آنکھوں پر نرمی سے انگلیاں پھیریں۔ پھر چائے کا گھونٹ لیا۔ چائے کے ساتھ ساتھ اس کی نیند غائب ہوتی چلی گئی۔ چائے نے اسے تازہ دم کر دیا تھا۔ جیسے اس کے دل و دماغ کے دریچے کھلتے چلے جا رہے ہوں۔ کہنے لگا۔

"اپنے سونے پران دنوں کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ اس رات ایسا ہوا کہ میں بالکل نہیں سو سکا۔"
یہ کہتے کہتے ہی کئی دہشت بھرے منظر تیزی سے اس کے تصویر میں ابھرے اور ایک غیر انسانی سی چیخ
اس کے دماغ میں گونج گئی۔

"یہ کس رات کا ذکر ہے۔ زوال ہو چکا تھا؟" اسلم نے سوال کیا اس نے سوچا پھر کہا "ٹھیک
یاد نہیں کہ وہ کونسی رات تھی۔ ویسے وہ سب راتیں ایک سی تھیں۔ ہوا یہ کہ۔۔۔" یہ کہتے
کہتے وہ چپ ہو گیا۔ اسلم زیدی، ظفر تینوں اس کی طرف متوجہ تھے۔ انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ
کر وہ سٹپٹایا۔ بولا "آئی بات ذہن سے اتر گئی۔ بہر حال اس کے بعد میں رات پھر نہ سو سکا۔"
رکا پھر بولا "اور پھر اس کے بعد تو یہ ہوا کہ سونا نصیب ہی نہیں ہوا۔ شاید پھر سویا ہی
نہیں —— یا شاید کبھی سو لیا ہوں۔۔۔"

اسلم زیدی ظفر تینوں نے بے دلی سے اس کی بات سنی۔ پھر وہ آپس میں گتھ گئے اور وہی بحث
کرنے لگے کہ ادھر والوں نے ان کا استحصال کیا۔ یا ادھر والوں نے غداری کی۔ اور وہ بیٹھا بیٹھا یہ
یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ ان راتوں میں وہ کسی رات سویا تھا یا نہیں سویا تھا۔ اسے کچھ یاد
نہ آیا۔ اور یہاں آنے کے بعد یہاں آنے کے بعد کا بھی سونے کا حساب وہ ٹھیک نہیں لگا سکا۔

اس حساب سے تھک کر وہ اسلم زیدی اور ظفر کی بحث پر متوجہ ہو گیا۔ سنتا رہا، سنتا رہا۔ سنتے
سنتے اس نے ایک جماہی لی اور غنودگی آمیز آنکھوں سے ظفر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یار مجھے نیند
آرہی ہے۔"

ظفر نے بے مزہ ہو کر اسے دیکھا۔ پھر مروت میں کہا۔ "تو پھر سو جاؤ۔"

"ہاں یار میں سونا چاہتا ہوں"۔ اس نے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ نیند بھری آواز میں
کہا۔ آگے کھسک کر سر صوفے کی نشست پر ٹکایا۔ اور پیر میز پر پھیلا لیے۔ اس طرح کہ اس
کی ایک خستہ حال جوتی اسلم کے مقابل تھی اور دوسری جوتی کی نوک زیدی کے روبرو۔ اور وہ
خراٹے لینے لگا۔

# کچھوے

وِدّیا ساگر چپ ہو گیا تھا۔ اس نے بھکشوؤں کو اونچی آوازوں سے بولتے سُنا، الجھتے دیکھا اور چپ ہو گیا۔ سنتا رہا، اور چپ رہا۔ پھر ان کے بیچ سے اٹھا اور نگر سے باہر نگر باسیوں سے دور ایک شال کے پیڑ کے نیچے سمادھی لگا کر بیٹھ گیا۔ اور کنول کے ایک پھول پر نظریں جمائیں جو کھِلا مسکایا اور مرجھا گیا۔ ایک پھول کے بعد دوسرا پھول دوسرے کے بعد تیسرا پھول جس پھول پر وہ دِرشٹی جماتا وہ پھوٹتا، مسکاتا اور مرجھا جاتا۔ یہ دیکھ اس نے شوک کیا اور آنکھیں موند لیں۔ بس دن آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔

دنوں بعد بیتے دنوں کے سنگھی سندر سمدرا اور گوپال اس کے پاس آئے بولے کہ "ہے ودیا ساگر ہم دکھ میں ہیں۔"

وِدّیا ساگر پرشانت مورتی بنا بیٹھا رہا۔ زبان سے کچھ نہیں بولا۔ گوپال دھیمی آواز میں بولا "کیسا اندھیر ہے۔ کہ جنہیں نہیں بولنا چاہیئے وہ بہت بول رہے ہیں۔ جسے بولنا چاہیئے وہ چپ ہو گیا ہے۔"

اور سندر سمدر بولا "سوبھدرا نے کہا اور انہوں نے کیا۔ سوبھدرا نے کہا تھا کہ تتھاگت اب ہمارے بیچ نہیں ہے۔ وہ سدا ٹوکتا رہتا تھا کہ یہ کرو اور یہ مت کرو۔ اب جو ہمارے جی میں

آئے گی وہ ہم کریں گے۔ ہے ودّیا ساگر، اب سب بھکشو وہی کرتے ہیں جو ان کے جی میں آتی ہے اور ان کا جی ترشنا کے جنگل میں ہے۔ گھاس کا بستر انہوں نے چھوڑ دیا۔ اب وہ کھاٹ پہ سوتے ہیں اور جاجم پہ بیٹھتے ہیں۔ ہے گنی ہے گیانی تو کیوں نہیں بولتا۔"

ودّیا ساگر نے آخر کو آنکھیں کھولیں۔ سندر سمدر اور گوپال کو غور سے دیکھا۔ پوچھا "بندھوؤ، تم نے طوطے کی جاتک سنی ہے؟"

"نہیں"

"تو پھر سنو" ودیا ساگر سنانے لگا۔ "بیتے سمے کی بات ہے کہ بنارس میں برہم دت کا راج تھا اور ہمارے بدھ دیو جی نے طوطے کے روپ میں جنم لیا تھا۔ ان کا ایک چھوٹا بھائی تھا۔ دونوں چھوٹے سے تھے کہ ایک چڑی مار نے انہیں پکڑا اور بنارس کے ایک برہمن کے ہاتھ بیچ دیا۔ برہمن نے دونوں طوطوں کو ایسے پالا جیسے اولاد کو پالتے ہیں ایک بار برہمن کو پردیس جانا پڑا۔ جاتے ہوئے طوطوں سے کہہ گیا کہ مٹھو ڈنک اپنی ماتا کا دھیان رکھنا۔

برہمن کے جانے کے بعد وہ ناری کھل کھیلی۔ چھوٹے طوطے نے اُسے ٹوکنے کے لئے پر تولے بڑے نے کہا کہ بندھو تو بیچ میں مت بول۔ پر چھوٹا نہ مانا اور ناری کو ٹوک بیٹھا۔ اس چاتر ناری نے بھولی بن کر کہا کہ اچھا اب میں کوئی پاپ نہیں کروں گی تو نے ٹوک دیا اچھا کیا۔ باہر آ تجھے پیار کروں۔ وہ بھولا باہر آ گیا۔ ناری نے جھٹ اس کی گردن مروڑ دی۔

جب دنوں بعد برہمن واپس آیا تو اس نے بڑے سے پوچھا کہ میاں مٹھو تمہاری ماتا نے میرے پیچھے کیا کیا۔ طوطا بولا کہ مہاراج جہاں کھوٹ ہو وہاں بدھیمان چپ رہتے ہیں کہ ایسی اوستھا میں بولنے میں جان کا کھٹکا ہے۔

طوطے نے یہ کہہ کر جی میں سوچا کہ جہاں بول نہیں سکتے وہاں جینا اجیرن ہے۔ وہاں چلو جہاں بول سکو۔ پر پھڑپھڑائے، برہمن سے کہا کہ مہاراج ڈنڈوت ہم چلے۔ برہمن نے پوچھا کہ میاں مٹھو کہاں چلے۔ بولا کہ وہاں جہاں بول سکیں۔ یہ کہہ کر بدھ ستوجی بنارس کی بھری بستی کو چھوڑ جنگل

کی ادراڑ کیے۔"

یہ جاتک سن کر وِدیا ساگر شال کے پیڑ کے نیچے سے اُٹھ آگے چل پڑا۔ چلتا رہا۔ چلتا رہا کالے کوسوں جا کر ایک نرجن بن میں باس کیا۔ سندر سمدر اور گوپال بھی ہرزج مرزج کھنچتے پیچھے پیچھے وہاں پہنچے۔

وِدیا ساگر تین رات بیراسن مارے آنکھیں موندے لیے کھائے پیے بیٹھا رہا۔ چوتھے دن سندر سمدر اور گوپال اپنے اپنے بھکشا پاتر لے کر اس بن سے نکلے اور شام بھرے بھرے بھکشا پاتروں کے ساتھ واپس آئے۔ وِدیا ساگر کے پاس بیٹھ کر بولے کہ "ہے وِدیا ساگر، کیا تتھاگت نے نہیں کہا تھا کہ پیٹ بھرنے کے لیے کھاؤ اور پیاس بجھانے کے لیے پیو۔"

یہ سن کر وِدیا ساگر نے آنکھیں کھولیں جو سامنے رکھا تھا اُسے کھایا ایسے جیسے اس میں کوئی سواد نہ ہو اور ندی کا نرمل جل پیا ایسے جیسے وہ گرم پانی ہو۔ پھر کہا کہ مٹی کو مٹی میں ارپن کیا۔

سندر سمدر نے یہ موقع اچھا جانا اور کہنے لگا کہ "ہے۔ وِدیا ساگر، بھکشو ست پنتھ سے پھر گئے ہیں۔ تتھاگت کے بتائے ہوئے نیموں کا پالن نہیں کرتے پیڑ کی چھاؤں چھوڑی، چھتوں تلے اونچی کھاٹوں پہ آرام کرتے ہیں۔ ایک سنگھ کے اندر کتنے سنگھ بن گئے۔ اور کتنی منڈلیاں پیدا ہو گئیں۔ ہر منڈلی دوسری منڈلی کی جان کی بیری ہے۔ تو پلٹ چل اور انہیں سکشا دے کہ تو ہمارے بیچ گنی اور گیانی ہے۔"

وِدیا ساگر بولا کہ "ہے سندر سمدر تو نے مینا کی جاتک سنی ہے؟"

"نہیں۔"

"تو سن۔ اگلے جنم کی بات ہے کہ بنارس میں راجہ برہم دت براجتا تھا اور ہمارے بودھ دیو جی مینا کے جنم میں جنگل میں باس کرتے تھے۔ ایک پیڑ کی گھنی ٹہنی میں ایک سندر گھونسلہ بنایا اور اس میں رہنے سہنے لگے۔ ایک بار بہت ورشا ہوئی۔ ایک بندر بھیگتا ہوا کہیں سے آیا اور اسی پیڑ پہ مینا کے گھونسلہ کے برابر بیٹھ گیا پر یہاں بھی وہ بوندوں سے بھیگ رہا تھا۔ مینا بولی

کر،، ہے منّوں، ویسے تو تو آدمی کی بہت نقالی کرتا ہے مگر گھر بنانے میں اس کی نقالی کیوں نہیں کرتا۔ آج تیرا گھر ہوتا تو درشا سے یہ تیری درُدشا کیوں ہوتی۔،، بندر بولا کہ ”بنباری مینا میں نقل کرتا ہوں پر عقل نہیں۔،، مگر پھر بندر نے یہ کہنے کے بعد سوچا کہ مینا اپنے گھر میں بیٹھی باتیں بنا رہی ہے اس کا گھر نہ ہو اور میری طرح بھیگے۔ پھر دیکھوں کیسے باتیں بنانی ہے یہ سوچ کے اس نے مینا کے گھونسلہ کو کھسوٹ ڈالا۔ بدھیستو جی اس موسلادھار مینہ میں گھر سے بے گھر ہو گئے۔ انہوں نے ایک گاتھا پڑھی جس کا منت یہ ہے کہ ہرایرا غیرا کو نصیحت کرنا مفت میں مصیبت مول لینا ہے یہ گاتھا پڑھتے وہ اس جنگل سے بھیگتے ہوئے دوسرے جنگل کی اور اڑ گئے،،

دڈیاساگر نے یہ جاتک سُن کر ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ بدھ دیو جی نے بندروں کے ساتھ کیا کیا اور بندروں نے بدھ دیو جی کے ساتھ کیا کیا،، پھر یہ جاتک سنائی۔

”بنارس کے راج سنگھاسن پر برہم دت براجتا تھا اور بدھ دیو جی نے بندر کا جنم لے کے جنگل بسایا ہوا تھا۔ بڑے ہو کے وہ ایک موٹے تازے بندر ہوئے اور راجہ کے آموں کے باغ میں بسنے والے بندروں کے راجہ بنے۔ ایک بار آموں کی رت میں راجہ باغ میں آیا اور بندروں کو دیکھ کر بہت کلپا کہ وہ آموں کا ناش کر رہے ہیں۔ اپنے پارکھیوں سے کہا کہ باغ کے گرد گھیرا ڈالو اور ایسے تیر چلاؤ کہ کوئی بندر بچ کے نہ جائے۔

بندروں نے یہ بات سُن لی۔ بدھیستو کے پاس گئے اور پوچھا کہ ہے بندر راجہ، بتا اب ہم کیا کریں۔ بدھیستو جی نے کہا کہ چنتا مت کرو۔ ابھی اُپائے کرتا ہوں۔ یہ کہہ کے وہ ایک ایسے پیڑ پہ چڑھے جس کی ٹہنیاں گنگا کے پاٹ پہ دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پاٹ پہ پھیلی ہوئی آخری ٹہنی سے دوسرے کنارے چھلانگ لگا کے فاصلہ ناپا اور اس ناپ کا ایک بانس توڑ دریا پار کی ایک جھاڑی سے باندھ پاٹ کے اوپر سے آم کی ٹہنی تک لانے کا جتن کیا۔ پر ناپ میں تھوڑی سی چوک ہو گئی۔ بانس اور ٹہنی کے بیچ ان کے دھڑ برابر فاصلہ رہ گیا۔ بدھیستو جی نے کیا کیا کہ بانس کے کونے کے ساتھ اپنی ایک ٹانگ باندھی اور اگلے ہاتھوں سے آم کی ٹہنی پکڑی۔

بندروں سے کہا کہ "لو میں پل بن گیا ہوں۔ تم میرے اوپر سے ہو کے بانس پہ جاؤ۔ بانس پہ سے گنگا پار کود جاؤ۔"

باغ میں گھرے ہوئے اسی ہزار بندر بدھیستوجی کی پیٹھ سے سہج سہج گزرے یہ سوچ کے کہ انہیں دکھ نہ پہنچے، پر بندروں میں دیودت بھی تھا اس نے بھی اُس سمے بندر کا جنم لیا تھا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ اسی جنم میں بدھ کا کام تمام کر دیا جائے وہ اس زور سے بدھیستوجی کی پیٹھ پہ کودا کہ وہ ادھ موئے ہو گئے۔

راجہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اس نے جلدی سے بدھیستوجی کو اوپر سے نیچے اتارا، گنگا میں اشنان کرا کے زرد بانا اڑھایا، سوگندھ لگائی اور دوا دارو پلائی۔ پھر ان کے چرنوں میں بیٹھا اور کہا کہ ہے بندر راجہ، تو اپنی پرجا کے لیے پل بنا پر تیری پرجا نے تیرے ساتھ کیا کیا۔ بدھیستوجی بولے کہ ہے راجہ اس میں تیرے لیے ایک سکشا ہے۔ راجہ کو چاہیے کہ پرجا کو دکھی نہ ہونے دے چاہے اس کے کارن اسے جان ہارنی پڑے یہ کہہ کے بدھیستوجی نے آخری ہچکی لی اور بندر کے جنم سے دوسرے جنم میں چلے گئے۔"

اس جاتک نے ودیا ساگر، سندر سمدر اور گوپال تینوں کو دکھی کر دیا۔ انہوں نے شوک کیا کہ تتھاگت نے جگ کو نستارنے کے کارن کتنے جنم لئے اور کیسے کیسے دکھ بھوگے پر ہر جنم میں دیودت ایسے دشٹ پیدا ہوتے رہے۔ اور تتھاگت کے لیے کٹھنائیاں پیدا کرتے رہے سندر سمدر نے پوچھا "ہے ودیا ساگر، کیا دیودت بدھ دیوجی کا بھائی نہیں تھا۔"

"بھائی ہی تھا۔" یہ کہہ کر ودیا ساگر پہلے ہنسا پھر رو دیا۔

"ہے گیانی تو ہنسا کیوں اور رویا کیوں؟" گوپال نے پوچھا۔

"جب بکری ہنس اور رو سکتی ہے تو میں کہ منش جاتی سے ہوں کیوں ہنس اور رو نہیں سکتا۔"

"سندر سمدر کو گرید ہوئی۔ "بکری کیوں ہنسی اور کیوں روئی۔"

وِدّیاساگر نے جواب میں ایک جاتک سنائی "ہے سنتو بیتے سمے کی بات ہے کہ بنارس میں برہم دت کا راج تھا۔ ایک برہمن نے کہ دیدوں کی وِدیا میں رچا بسا تھا مردوں کو بھوجن دینے کے دھیان سے ایک بکری خریدی۔ بکری کو اشنان کرایا۔ گلے میں گجرا ڈالا۔ بکری اپنے بھینٹ کی یہ تیاریاں دیکھ کے پہلے ہنسی، پھر رو دی۔ برہمن نے پوچھا کہ ہے بکری تو ہنسی کیوں اور روئی کیوں بکری بولی کہ "ہے برہمن، اگلے جنم میں میں بھی برہمن تھی اور میں بھی دیدوں کی وِدیا میں ہیری ہوئی تھی اور میں نے بھی ایک بار مردوں کو بھوجن دینے کے لیے ایک بکری لی تھی اور اس کا گلا کاٹا تھا۔ پر ایک بار بکری کا گلا کاٹنے کے بدلے میں میرا گلا پانچ سو بار کاٹا گیا۔ آج پانچ سو اکیویں بار میرے گلے پر چھری پھرے گی۔ میں یہ دھیان کر کے ہنسی کہ آج آخری بار میرا گلا کٹ رہا ہے اس کے بعد اس دکھ سے میرا انت ہو جائے گا۔ اور میں یہ دھیان کر کے روئی کہ میرا گلا کاٹنے کے بدلے میں اب تجھے پانچ سو بار گلا کٹانا پڑیگا۔"

برہمن بولا کہ "ہے بکری تو ڈر مت میں تیرا گلا نہیں کاٹوں گا۔"

بکری زور سے ہنسی اور بولی کہ "مجھ بکری کا گلا تو کٹنا ہی ہے تیرے ہاتھوں نہیں کٹے گا تو کسی اور کے ہاتھوں کٹے گا۔"

برہمن نے بکری کی سنی ان سنی کی۔ اُسے آزاد کیا اور چیلوں سے کہا کہ دیکھو اس کی رکھشا کرو۔ چیلوں نے اس کی بہت رکھشا کی پر ہونی ہو کر رہی۔ اس بکری نے چرتے چرتے ایک پیڑ کی ٹہنی پر منہ مارا۔ وہ پیڑ اس پہ گرا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔

ہے سنتو اب سنو کہ اسی پیڑ کے برابر ایک سندر پیڑ کھڑا تھا۔ یہ بدھیستو جی تھے جنہوں نے ترور کے روپ میں جنم لیا تھا۔ انہوں نے ترت ترور کا جنم چھوڑا۔ اور ہوا کے بیچ آسن جما کے بیٹھے۔ جنتا نے یہ دیکھ اچنبھا کیا اور اکٹھی ہونے لگی۔ بدھیستو جی نے اس گھڑی ایک منگل گاتھا پاٹھ کی جس کا ارتھ یہ ہے۔ کہ پرنتو ہنسا کا انت دیکھو جو دوسرے کا گلا کاٹے گا ایک دن اس کا بھی گلا کاٹا جائے گا۔"

سندر سمدر اور گوپال نے یہ جاتک دھیان سے سنی اور شردھا سے سر جھکالیا۔ مگر پھر سندر سمدر بولا کہ "ہے گیانی میرا سوال جوں کا توں ہے۔ کیا دیودت بدھ دیوجی کا بھائی نہیں تھا؟"

ودّیا ساگر بولا "ہے سندر سمدر، یہ پرشن مت کر نہیں تو میں پھر پہلے ہنسوں گا اور پھر روؤں گا۔"

"ہے گیانی تو کیوں ہنسے گا اور کیوں روئے گا؟"

"میں یہ بتا کے ہنسوں گا کہ دیودت ہمارے بدھ دیوجی کا بھائی تھا اور یہ دھیان کر کے روؤں گا کہ وہ بھکشو بھی تھا۔"

سندر سمدر یہ سن کر رو دیا اور بولا کہ "ہے پربھو بھکشوؤں کو کیا ہو گیا ہے؟"

ودّیا ساگر نے سندر سمدر کو گھور کر دیکھا "ہے سندر سمدر، یہ مت پوچھ۔"

"کیوں نہ پوچھوں؟"

"مت پوچھ کہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ برائی کا کھوج کرتے کرتے انت میں ہمیں اپنا ہی آپا دکھائی دیتا ہے۔"

"یہ کیسے؟"

"یہ ایسے کہ بنارس کے راجہ برہم دت کی رانی کسی دوسرے مرد سے مل گئی۔ راجہ نے اس سے پوچھ گچھ کی تو اس نے کہا کہ میں کسی پرائے سے ملی ہوں تو میں مرنے کے بعد چڑیل بن جاؤں اور میرا مستہ گھوڑی کا ہو جائے اور ایسا ہوا کہ رانی مر کے سچ مچ چڑیل بن گئی اور اس کا مستہ گھوڑی کا سا ہو گیا۔ وہ ایک بن میں جا کے ایک کھوہ میں رہنے لگی۔ آتے جاتے کو پکڑتی اور کھا لیتی۔ ایک دن ایک برہمن ٹکشیلا سے ودّیا پراپت کر کے آ رہا تھا۔ چڑیل اسے کمر پہ لاد کے اپنی کھوہ میں لے گئی۔ پر برہمن جوان تھا۔ جب انگ سے انگ ملا تو چڑیل گرما گئی۔ کھوہ میں لے جا کے اس سے کھیلنے لگی۔ برہمن ودھوان تھا۔ پر جوان بھی تو تھا۔ ودّیا اپنی جگہ جوانی اپنی جگہ۔ وہ بھی گرما گیا۔ جوما جاٹی کی اور بھوگ کیا۔ اس بھوگ سے چڑیل کو گربھ رہا۔ نو مہینے بعد اس نے پتر جنا۔ یہ پتر داستو

ہیں ہمارے بدھ دیو مہاراج تھے۔ جنہوں نے ایک بار چڑیل کے پتر کے روپ میں جنم لیا تھا۔

بدھیستوجی نے بڑے ہو کے باپ کو چڑیل کے جنگل سے نکالنے اور منش جاتی کے بیچ جانے کی ٹھانی چڑیل نے کہا میرے لال تو نے منش جاتی کے بیچ جانے کی ٹھان ہی لی ہے تو اپنی میا کی بات سن لے کہ چڑیلوں کے بیچ گزارہ کرنا آسان ہے آدمی کے ساتھ گزارہ کرنا کٹھن کام ہے میں تجھے ایک ٹوٹکا بتاتی ہوں جو اس دنیا میں تیرے کام آئے گا۔ اس ٹوٹکے کے بل پہ تو آدمی کے پاؤں کے نشان بارہ کھونٹ تک دیکھ سکتا ہے۔

اپنی میا سے یہ ٹوٹکا لے کے پوت پتا کے سنگ بنارس پہنچا اور اپنا گن بتا کے راجہ کے دربار میں چاکری کر لی۔ درباریوں نے یہ دیکھ کے کھسر پھسر کی اور راجہ سے کہا کہ مہاراج پرکھنا تو چاہیئے کہ اس آدمی کے پاس یہ گن ہے بھی یا نہیں۔ راجہ نے اس کی پرکھشا کے لیے کیا کیا کہ خزانے کا مال چوری کیا اور دور جا کے ایک تالاب میں ڈبو دیا۔ دوسرے دن شور مچا کہ خزانے میں چوری ہو گئی بدھیستوجی سے کہا کہ چوری کا پتا لگاؤ۔ بدھیستوجی نے جھٹ پٹ پاؤں کے نشان دیکھے اور تلیا سے مال برآمد کر دیا۔

راجہ نے کہا کہ تو نے چور کا پتا نہ بتایا۔ بدھیستوجی نے کہا کہ مہاراج مال مل گیا، چور کا پتا پوچھ کے کیا کرو گے۔ راجہ نہ مانا، کہا کہ چور کا پتا بتا۔ بدھیستوجی نے کہا کہ ہے راجہ میں ایک کہانی سناتا ہوں تو بدھیمان ہے۔ جان لے گا کہ اس کا ارتھ کیا ہے۔ ایک نرتکار گنگا میں اشنان کرتے ہوئے ڈوبنے لگا۔ اس کی بھارد واج نے یہ دیکھا تو چلائی کہ سوامی تم تو ڈوب رہے ہو۔ مجھے بانسری بجا کے کوئی دھن سکھا دو کہ میرے پاس کچھ گن آ جائے۔ اور تمہارے بعد میں پیٹ پال سکوں۔ نرتکار ڈبکیں کھاتے ہوئے بولا کہ اری بھاگوں بھری میں بانسری کیا بجاؤں اور کیا دھن سناؤں۔ پانی جو جیو جنتو کو طراوت دیتا ہے اور دھرتی مٹی میں جان ڈالتا ہے مجھے مار رہا ہے پھر اس نے ایک گاتھا پڑھی کہ جس کا ارتھ یہ ہے کہ جو میرا پالن ہار تھا وہی میرا جان لیوا بن گیا۔

بدھیستوجی نے یہ سنا کے کہا کہ مہاراج، راجہ بھی پرجا کے لیے پانی سمان ہے اگر پالن ہار ہی جان لیوا بن جائے تو پرجا کہاں جائے۔

راجہ نے کہانی سنی پر اُسے چین نہ آیا بولا کہ متر کہانی اچھی تھی پر میں تجھ سے چور کی لوہ چھتا ہوں وہ بتا۔

بدھیستوجی نے کہا کہ مہاراج جو میں کہتا ہوں وہ کان لگا کے سنو۔ اور پھر انہوں نے یہ کہانی سنائی بنارس میں ایک کمہار رہتا تھا۔ روز نگر سے نکل کے جنگل جاتا اور اپنے برتن بھانڈوں کے لئے مٹی کھود کے لاتا۔ ایک ہی استھان سے مٹی کھودتے کھودتے ایک گڈھا بن گیا تھا ایک دن اس گڈھے میں اُتر کے مٹی کھود رہا تھا کہ آندھی چل پڑی اور اوپر سے ایک تو دہ اس پر گر پڑا۔ بیچارے کا سر پھٹ گیا۔ وہ چلایا اور یہ گاتھا پڑھی کہ جس دھرتی سے کونپل پھوٹتی ہے اور جیو کو جینا ملتا ہے اسی دھرتی نے مجھے کچل ڈالا۔ جو میرا پالن ہار تھا وہی میرا جان لیوا بن گیا۔ اور پھر بدھیستوجی نے کہا کہ مہاراج راجہ پر پرجا کے لئے دھرتی سمان ہے۔ وہ پرجا کو پالتا ہے۔ پر راجہ پرجا کو موسنے لگے تو پرجا کہاں جائے۔

راجہ نے کہانی سنی اور کہا کہ کہانی میری بات کا جواب نہیں تو چور پکڑ اور میرے سامنے لا۔ بدھیستوجی نے کہا، مہاراج اسی بنارس کے نگر میں ایک جنا تھا۔ ایک بار وہ بہت بھات کھا گیا۔ اس کی ایسی درد شا ہوئی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ چلاتا تھا اور کہتا تھا کہ جس بھات سے ان گنت برہمنوں کو سکت ملتی ہے اسی بھات نے میری سکت چھین لی۔ اور ہے مہاراج، راجہ بھی پرجا کے لیے بھات سمان ہے وہ اس کی بھوک دور کرتا ہے اور سکت دیتا ہے۔ پر اگر راجہ ہی پرجا کا بھات چھین لے تو پرجا کہاں جائے۔

راجہ نے یہ کہانی بھی ایک کان سنی اور دوسرے کان اڑائی۔ کہا کہ متر مجھے کہانیوں پہ مت ٹرخا۔ چور کا پتا بتا۔ بدھیستوجی بولے "مہاراج ہمالہ پہاڑ پہ ایک پیڑ تھا۔ اس میں بہت سی ٹہنیاں تھیں۔ ان ٹہنیوں میں بہت سی چڑیاں بسیرا کرتی تھیں۔ ایک بار دو موٹی ٹہنیوں نے ایک دوسرے سے رگڑ کھائی اور ان سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ یہ دیکھ ایک چڑیا چلائی کہ پنچھیو یہاں سے اڑ چلو کہ جس ترور نے ہمیں شرن دی تھی۔ وہی اب ہمیں جلانے پر تلا ہے جو ہمارا پالن ہار تھا وہ ہمارا جان لیوا بن گیا۔ اور

ہے مہاراج جس پرکار پیڑ چڑیوں کو شرن دیتا ہے اسی پرکار راجہ پرجا کو شرن دیتا ہے۔ پر اگر شرن دینے والا ہی چور بن جائے تو چڑیاں کہاں جائیں۔

وہ مورکھ راجہ اس پر بھی کچھ نہ سمجھا۔ دہی مرغے کی ایک ٹانگ کہ چور کا نام بتا۔ بدھیستوجی نے ہار کے کہا کہ اچھا سب پرجا کو اکٹھا کرو۔ پھر میں چور کا نام بتاؤں گا۔ راجہ نے ڈھنڈی پٹوا کے ساری پرجا کو اکٹھا کر لیا۔ تب بدھیستوجی نے اونچی آواز سے کہا کہ ہے بنارس نگر کے باسیو کان لگا کے سنو اور دھیان دو۔ جس دھرتی میں تم نے اپنا دھن دابا تھا اسی دھرتی نے تمہارا دھن موس لیا۔

لوگ یہ سن کے چونکے۔ انہوں نے تاڑ لیا کہ بدھیستوجی نے کیا کہا۔ وہ راجہ پر پل پڑے۔ پھر اُسے ہٹا کے بدھیستوجی کو راج سنگھاسن پہ بٹھایا اور ان کی جے بولی۔"

یہ سنتے سنتے سندر سمدر اور گوپال دونوں نے اتساہ سے تتھاگت کی جے بولی۔ ودیا ساگر نے دونوں کو دیکھا یہ جاننے کے لیے کہ ان میں پوچھنے کی جیتک ابھی تک ہے یا جاتی رہی۔ پھر کہا کہ "بھکشوؤ بتانے والا ہمیں تمہیں سب کچھ بتا کے پرلوک کو سدھارا ہے سو اب کسی سے مت پوچھو اور اب اپنا دیا آپ بنو کہ امی تابھ نے سدھارتے سمے آنند سے یہی کہا تھا۔"

سندر سمدر اور گوپال دونوں تتھاگت کے سدھارنے کا دھیان کر کے دکھی ہوئے اور بولے کہ جس دیئے نے جگ میں جوت جگائی تھی اور ہمیں ڈگر دکھائی تھی۔ وہ دیا بجھ گیا۔ اب سرشٹی میں اندھکار ہے ہم اپنے دیوں کے دھندلے اجالوں میں بھٹکتے ہیں۔ اندھیری چل رہی ہے اور اندھکار بڑھتا جا رہا ہے اور ہمارے ٹمٹماتے دیوں کی لو مندی ہوتی چلی جا رہی ہے۔"

ودیا ساگر نے انہیں ٹوکا اور کہا کہ "سنو تم امی تابھ کے لیے کیسی بات دھیان میں لاتے ہو۔ وہ تو امر جوتی ہیں وہ کیسے بجھ سکتے ہیں۔"

یہ سن کر سندر سمدر اور گوپال دونوں اپنی چوک پر پچھتائے ایک شردھا کے ساتھ امی تابھ کو دھیان میں لائے اور دھرتی سے انتر تک انہوں نے ایک اجالا پھیلا دیکھا۔ ان کی دیہی کانپنے لگی۔ اور آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ ودیا ساگر کے سنگ مل کر انہوں نے پرارتھنا کی کہ ہم بھکشو تتھاگت

امی تابھ کی پرارتھنا کرتے ہیں جو دیوستھان میں باس کرتے ہیں جہاں ہر سمے ان پر سوگندھت پھول برستے ہیں۔ ہے آتماروپی، ہے ہمارے شاکیہ منی، ہے دریا کے ساگر، ہے امی تابھ، ہم تم کو سمان کے ساتھ بلاتے ہیں تم ہمارے استھان میں آ کے باس کرو اور ہمارے اندر جوت جگا دو"۔

پھر وہ چپ ہو گئے، پر آنسوؤں کی گنگا دیر تک بہتی رہی۔ پھر انہوں نے ان دنوں کو یاد کیا جب امی تابھ ان کے بیچ موجود تھے اور نگر نگر ڈگر ڈگر گیا بستی کیا جنگل سب جگہ اجالا پھیلا تھا۔ دریا ساگر بولا "ان دنوں ہم امی تابھ کے سنگ رات رات بھر چلتے تھے۔ اندھیری راتوں میں گھنے بنوں سے گزرتے تھے پر کبھی مجھے یہ نہیں لگا کہ اندھیرے میں چل رہا ہوں۔ ڈگر ایسے دکھائی دیتی تھی جیسے پورنماشی کا چاند نکلا ہوا ہو۔ پیڑ پودے، پھول پتے جانو کہ پوری دھرتی اور سارا انبر اجیارا ہے اور امی تابھ کی جے دھنی کرتا ہے۔

گوپال سنتے سنتے ان دنوں کو دھیان میں لایا۔ کہنے لگا "سنتو ان دنوں ہم کتنا چلتے تھے۔ نس دن چلتے ہی رہتے تھے، کبھی گھنے جنگلوں میں کبھی چٹیل میدانوں میں اور کبھی بھکشا پاتر لیے نگر نگر گلی گلی"۔

سندر سمدر کل سے زرت آج میں آ گیا دکھ سے بولا "اب بھکشوؤں نے چلنا چھوڑ دیا۔ ان کے پاؤں تھک گئے ہیں، شریر پھیل گئے ہیں اور توندیں پھول گئی ہیں"۔

اس پہ دریا ساگر نے کہا "بندھو، تتھاگت نے کہا تھا کہ جو جیو بہت کھا کھا کے موٹا ہو گیا ہے اور بہت سوتا ہے وہ جنم چکر میں پھنسا رہے گا۔ سوئر کے سمان بار بار پیدا ہو گا بار بار مرے گا"۔

سندر سمدر نے کہا "ہے گیانی، وہ بہت کھاتے ہیں اور کھاٹ پہ سوتے ہیں اور گدوں پہ لوٹتے ہیں اور ناری سے ہنس کے بولتے ہیں۔

"ناری سے ہنس کے بولتے ہیں؟" دریا ساگر نے ڈری آواز میں کہا۔

"ہاں بندھو، ناریوں سے ہنس کے بولتے ہیں۔ اور میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ خود سنگھ کی بھکشونیاں مسکا کے بات کرتی ہیں اور اچھا بھوجن پہنتی ہیں"۔

دریا ساگر نے آنکھیں موند لیں اور دکھ کی آواز میں بڑبڑایا "ہے تتھاگت تیرے بھکشو تجھ سے

بکھر گئے ہیں میں اس بھوساگر میں اکیلا ہوں۔"

سندر سمدر اور گوپال نے بھی آنکھیں موند لیں اور گڑگڑائے "ہے تتھاگت ہم اکیلے ہیں اور دکھی ہیں اور ہمارے اردگرد بھوساگر امنڈا ہوا ہے۔"

وہ آنکھیں موندے بیٹھے رہے۔ پھر سندر سمدر نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ گوپال تو نے یہ دھیان کیا کہ ہم آج پوری بستی میں پھرے ہیں۔ ہمیں بھکشا میں سب کچھ ملا، پر کھیر نہیں ملی۔"

گوپال نے ہاں میں ہاں ملائی "تو نے سچ کہا۔ کھیر ہمیں کسی گھر سے نہیں ملی۔ اور کھیر تو اب کبھی کبھی ہی دیکھنے میں آتی ہے۔"

سندر سمدر نے سوال اٹھایا "میں پوچھتا ہوں کھیر اب گھروں میں کیوں نہیں پکتی۔ کیا لوگ تتھاگت کو بھول گئے ہیں یا گیوں نے دودھ دینا کم کر دیا ہے۔"

گوپال بیتے دنوں کو یاد کر کے کہنے لگا "ان دنوں سب نرناری تتھاگت کے نام کی مالا جپتے تھے اور گیوں کے تھن دودھ سے بھرے رہتے تھے اور گھروں میں کھیر اتنی پکتی تھی کہ گھر باہر والے جی بھر کے کھاتے تھے، پھر بھی بچ رہتی تھی۔"

"اور ہم کتنا سواد لے کر کھیر کھاتے تھے۔" سندر سمدر کے منہ میں پانی بھر آیا۔

ودیا ساگر نے گھور کر اُسے دیکھا۔ "سواد؟ ہے مورکھ، کیا تو سواد لے کے بھوجن کرتا ہے۔"

"نہیں پربھو" سندر سمدر نے جھینپ کر کہا "میں نے بھوجن کبھی سواد لے کے نہیں کھایا۔ سدا یہی دھیان کر کے کھایا کہ مٹی میں مٹی مل رہی ہے اور پیٹ بھر رہا ہوں۔ پر جب کھیر آتی تھی تو میرے دھیان میں وہ کھیر آجاتی تھی۔ جو سجاتا نے تتھاگت کو کھلائی تھی اور میرے تالو اور جیبھ کو کچھ ہونے لگتا تھا۔

ودیا ساگر نے دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ "بندھو، بھولے دنوں کو یاد مت کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پھر اندریوں کے پھیلے جال میں پھنس جاؤ۔"

دونوں نے کان پکڑے اور کہا "پربھو ہم ہر سواد کو تیاگ چکے ہیں۔ بس تتھاگت کے دھیان میں سواد لیتے ہیں۔"

ایک بار شاکیہ منی ان کے دھیان میں پڑ گئے جو اُٹھتے بیٹھتے بھکشوؤں کو اپدیش دیتے کہ سنسار، اسار ہے اور سنسار کے سواد کھوکھلے ہیں۔ گوپال بولا "سندر سمدر، تجھے وہ گھڑی یاد ہے جب تتھاگت نے تجھے ناری سواد کے جال سے نکالا تھا۔"

"ناری سواد کے جال سے؟" سندر سمدر نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"ارے مورکھ تو بھول گیا۔ مجھے وہ سمے آج تک یاد ہے۔ تتھاگت آنکھیں موندے پرشانت مورتی بنے بیٹھے تھے اور ہم پریم اور شردھا سے انہیں تک رہے تھے ہم نے دیکھا ان کے ہونٹ تنک مسکائے۔ آنند نے پوچھا کہ ہے تتھاگت، مسکانے کا کارن کیا ہوا۔ بولے کہ اس سمے ایک بھکشو کا ناری سے مقابلہ ہے۔"

"مقابلہ میں کون جیتے گا؟" آنند نے پوچھا۔

"مقابلہ کڑا ہے" تتھاگت بولے۔ "ناری چاتر ہے۔ گلے لگتی ہے اور مچل کے نکل جاتی ہے۔ انگ دکھاتی ہے اور چھپا لیتی ہے۔ چھلکتی چھاتیوں کی جھلک دکھاتی ہے پھر اوٹ کر لیتی ہے۔ لہنگا اتارنے لگتی ہے، پھر چڑھا لیتی ہے۔"

سندر سمدر دھیان سے سنتا رہا۔ اُسے اس بیتی گھڑی کی ایسے یاد آئی جیسے سمندر امنڈ کے آتا ہے بولا۔

"گوپال تو نے کب کی بات یاد دلائی۔ ہاں مقابلہ بہت سخت تھا۔ کیا ناری تھی مانو کنول کا پھول ہیں پہلے اس بستی میں جا نکلی گلی پھرتا اور رکیں۔ نردھن کیا دھنوان ہر چوکھٹ پہ جا کے بھکشا لیتا۔ پر اس کی سندرتا نے مجھے ایسا موہت کیا کہ سب رستے بھولا۔ بس اسی چوکھٹ کا ہو رہا۔ روز بھکشا پاتر لئے اس دوارے جاتا اور آواز لگاتا کہ سندری بھکشو کو بھکشا ملے۔ اس چھبیلی نے مجھ پہ بہت دیا کی اور بہت بھکشا دی۔ میں نے بہت سواد لوٹا اور ایک دن تو اتنی دیا لو بنی کہ میں نے جانا کہ گنگا نہا لوں گا۔ اندر لے جا کے سانکل لگالی اور گود میں پھول کے سمان آپڑی ہے گوپال مت پوچھ کہ کیسی کومل سرل گات تھی۔ کیا رسیلا سینہ تھا اور کیسے بھرے بھرے کولہے تھے۔ اور پیٹ بالکل ملائی انگ سے انگ ملنے لگا تھا کہ تتھاگت کی مورتی پرکاشت ہوئی۔" سندر سمدر ٹھنڈا سانس لے کر چپ ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا؟" گوپال نے پوچھا۔

سندر سمدر نے مری سی آواز میں کہا "پھر کیا ہونا تھا۔ میں نے باسنا کو مارا اور بیٹھی ندی سے بے پٹے نکل آیا۔"

سندر سمدر نے چپ ہو کر آنکھیں بند کر لیں جیسے دور کے دھیان میں کھو گیا ہو۔ پھر آنکھیں کھولیں دھیرے سے بولا "اب وہ کہاں ہو گی۔"

"کون؟" گوپال نے اچنبھے سے اُسے دیکھا۔

"وہی سندری"

"کون جانے کہاں ہو۔"

سندر سمدر اُٹھ کھڑا ہوا۔ گوپال نے ایک اچنبھے کے ساتھ دیکھا کہ اس کے قدم بستی کی طرف اُٹھ رہے ہیں۔ گوپال پکارا "بندھو پلٹ آ"۔ سندر سمدر کھویا کھویا چلتا چلا گیا۔ گوپال نے زور سے آواز دی۔ "بندھو، پلٹ آ۔"

ودیا ساگر خشک آواز میں بولا "سندر سمدر اب پلٹ کے نہیں آئے گا کہ وہ اب باسنا کے جنگل میں ہے۔"

گوپال چلایا "ہے ودیا ساگر ایسا جتن کر کہ وہ باسنا کے جنگل سے نکلے اور پلٹ آئے۔"

ودیا ساگر نے اسی خشک آواز میں کہا "ہے گوپال تو اسے بھول جا۔ اپنے آپ کو بچا سکتا ہے تو بچا لے۔"

"پر بھو، میری چنتا مت کر۔ میں بچا ہوا ہوں۔"

ودیا ساگر نے اس پہ کچھ نہیں کہا۔ چپ رہا۔ پھر زہر بھری ہنسی ہنسا اور بولا "جو یاں سب سے بڑا بول بول رہا تھا وہ سب سے پہلے گیا۔ باسنا اُسے ایسے بہا لے گئی جیسے باڑھ سوتے گاؤں کو بہا لے جاتی ہے۔"

گوپال ودیا ساگر کا منہ تکنے لگا۔ پھر بولا "ہے گنی گیانی بولتے میں کیا بُرائی ہے۔"

ودیا ساگر کہنے لگا "بندھو شاید تو نے زیادہ بولنے والے کی جاتک نہیں سنی۔ اچھا تو

سُن۔ ہمارے بدھ جی مہاراج ایک بار ایک درباری کے گھر جنمے تھے۔ بڑے ہو کے راجہ کے منتری بنے۔ مگر وہ راجہ بہت بولتا تھا۔ بدھیستوجی نے من میں وچار کیا کہ کسی پرکار راجہ پر جتایا جائے کہ راجہ کی بڑائی زیادہ بولنے میں نہیں۔ زیادہ سننے میں ہے۔

اب سنو کہ ہمالہ پہاڑ کی تلی میں ایک تلیا تھی۔ وہاں ایک کچھوا رہتا تھا۔ دو مرغابیاں بھی اُڑتی وہاں آئیں۔ تینوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ پر ایک سمے ایسا آیا کہ تلیا کا پانی سوکھنے لگا۔ مرغابیوں نے کچھوے سے کہا کہ متر ہمالہ پہاڑ میں ہمارا گھر ہے وہاں بہت پانی ہے تو ہمارے سنگ چل وہاں چلین سے گزرے گی۔

کچھوا بولا کہ ”متر میں دھرتی پر رینگنے والا جانور، بھلا اتنی اونچائی پہ کیسے پہنچوں گا“۔

مرغابیوں نے کہا کہ ”اگر تو یہ وچن دے کہ تو زبان نہیں کھولے گا تو ہم تجھے وہاں لے چلیں گے“۔ کچھوے نے چپ رہنے کا وچن دیا۔ مرغابیوں نے ایک ڈنڈی لا کے کچھوے کے سامنے رکھی اور کہا کہ بیچ میں سے اپنے دانتوں سے پکڑ اور دیکھ بولنا مت۔ پھر ایک مرغابی نے اپنی چونچ سے ڈنڈی کا ایک سرا اور دوسری نے اپنی چونچ سے دوسرا سرا پکڑا اور اڑ لیے۔ اڑتے اڑتے جب وہ ایک نگر سے گزرے تو بالکوں نے یہ تماشا دیکھا اور شور مچایا۔ کچھوے کو بہت غصہ آیا۔ وہ کہنے لگا تھا کہ اگر میرے متروں نے سہارا دیا ہے تو تم کیوں جل مرے۔ مگر اس نے یہ کہنے کے لیے جیبھ کھولی ہی تھی کہ ٹپ سے زمین پہ گر پڑا۔

اب سنو کہ یہ کچھوا جہاں گرا تھا وہ جگہ راجہ کے محل میں تھی۔ محل میں شور مچا کہ ایک کچھوا ہوا میں اڑتے اڑتے زمین پہ گر پڑا ہے۔ راجہ بدھیستوجی کی سنگت میں اس جگہ آیا۔ کچھوے کی دردشا دیکھ کے بدھیستوجی سے پوچھا ”ہے بدھیمان تو کچھ بتا کہ کچھوے کی یہ گت کیسے بنی“۔

بدھیستوجی نے ترت کہا ”یہ بہت بولنے کا پھل ہے“۔ اور کچھوے اور مرغابیوں کی پوری کہانی سنائی پھر کہا کہ ”ہے راجہ جو بہت بولتے ہیں ان کی یہی درگت کیسے بنتی ہے“۔

راجہ نے بدھیستوجی کی بات پر جی ہی جی میں وچار کیا۔ بات اس کے جی کو لگی۔ اس دن کے

بعد سے یہ ہوا کہ وہ کم بولتا تھا اور زیادہ سنتا تھا۔

یہ حکایت سُنا کر ودیا ساگر نے کہا کہ "سندھو ہم بھکشو لوگ بچھوے میں اور رستے بیں ہیں، جو موقع بے موقع بولے گا وہ گر پڑے گا اور رہ جائے گا۔ تو نے دیکھا کہ سندر سمدر کس بُری طرح گرا اور رہ گیا۔"

گوپال کے جی میں یہ بات اتر گئی۔ بولا کہ "کتنے بھکشو ابھی رستے میں تھے کہ گر پڑے اور رہ گئے۔" پھر کہا "اب میں چپ رہوں گا۔"

اور گوپال سچ مچ چپ ہو گیا۔ گیان دھیان کرتا، بھکشا لینے بستی جاتا اور کسی سے بات کئے بنا واپس آجاتا۔ پر ایک دن اس بستی کے بیچ اس کے نگر باسی اور بچپن کے متر نے بھاگ کر اُسے آن پکڑا۔ کہا کہ "ہے متر میں تیرے لئے راج کا سندیش لایا ہوں۔ سُن کہ تیرا پتا پرلوک سدھارا۔ اب راج گدی خالی پڑی ہے۔ تیری ماتا تجھے بلاتی ہے اور تیری سندر استری سولہ سنگھار کئے تیری باٹ دیکھتی ہے۔"

گوپال نے کہا کہ "ہے متر، یہ سنسار دکھ کا استھان ہے۔ راج پاٹ موہ کا جال ہے۔ ماتا پتا استری مایا کا کھیل ہیں۔ ہم بھکشو تتھاگت کے بالک ہیں۔"

یہ کہہ کر گوپال مڑ لیا۔ پر بھاگ کر پیچھے سے پکارا۔ "متر میں نے تیری بات سنی۔ پھر بھی میں تجھ سے کہتا ہوں کہ میں تین دن اس بستی میں رہوں گا اور اسی استھان پہ بیٹھ کے تیری باٹ دیکھوں گا۔"

گوپال واپس ہونے کو تو ہو لیا پر بہت بیاکل تھا پر بھاگ کی آواز رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ ودیا ساگر کے پاس آ کے ایسے بیٹھا جیسے پیڑ سے پتا گرتا ہے۔ بولا کہ "ہے گیانی۔ میں چپ ہوں پھر بھی گر رہا ہوں۔ ڈنڈی میرے دانتوں سے نکلی پڑ رہی ہے بتا کہ میں کیا کروں۔"

ودیا ساگر نے کہا "پھول کو دیکھ۔"

گوپال پاس کی ایک پھولوں کی جھاڑی کے سامنے آسن مار کر بیٹھا اور ایک پھول کو کہ ابھی ابھی کھلا تھا تکنے لگا۔ تکتا رہا۔ پھول مسکاتا رہا۔ پر پھر دھیرے دھیرے رنگ بے رنگ ہوا اور پھول مرجھا گیا۔ گوپال کو جیسے کل آ گئی ہو۔ اپنے آپ سے کہا کہ ہے گوپال سنسار اسار ہے اور آنکھیں بند کر لیں۔ پر جب بھور بھئے اس نے آنکھیں کھولیں تو اسی ٹہنی پہ ایک پھول کھلا ہوا تھا اور اُسے

دیکھ دیکھ مسکا رہا تھا۔ کھلے پھول کو دیکھ وہ بیاکل ہو گیا۔ اس کی درشٹی بکھر گئی۔ آنکھیں ادھر اُدھر بھٹکنے لگیں اور اسے یاد آیا کہ آج تیسرا دِن ہے۔ وہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کے پاؤں آپ ہی آپ بستی کی طرف اُٹھنے لگے۔

وِدیا ساگر اُسے جاتے دیکھتا گیا اور چپ رہا جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ زہر بھری ہنسی ہنسا۔ پھر اُسے تتھاگت کی کہی ہوئی بات یاد آئی کہ یاترا میں اگر سوجھ بوجھ والا سنگھی ساتھی نہ ملے تو بھلائی اسی میں ہے کہ یاتری اکیلا چلے، جنگل میں چلتے ہاتھی کی سمان۔

تتھاگت کی یہ بات یاد کر کے اسے بہت ڈھارس ہوئی۔ اس نے اس پر وچار کیا اور اسے اس میں بہت گمبھیرتا دکھلائی دی۔ میں نے تتھاگت سے پہلے سُنا اور اب جانا کہ جو آدمی مورکھ کے ساتھ چلتا ہے وہ رستے میں بہت دکھ اٹھاتا ہے۔ مورکھ کی سنگت سے یہ اچھا ہے کہ آدمی اکیلا رہے اور اکیلا چلے اس نے یاد کیا کہ سندر سمدر اور گوپال کی سنگت نے اس کے گیان میں کتنی کھنڈت ڈالی ہے وہ بولتے ہی رہتے تھے اور اس کا دھیان بار بار بٹ جاتا تھا اُسے لگا کہ کتنے منوں کا بوجھ تھا جو ان کے چلے جانے سے اس کے سر سے اتر گیا ہے۔ اس نے اب اپنے آپ کو ہلکا ہلکا جانا اور نچنت ہو کر جنگل میں گھومنے لگا وہ کبھی اونچی اونچی گھاس کے بیچ چلا۔ کبھی کسی بٹیا پر پڑ لیا۔ کبھی کسی اونچی ڈگر پہ ہو لیا۔ اس کے ڈال ڈال پات پات کو دیکھا۔ پھولوں کو مسکاتے اور ٹہنیوں کو لہراتے دیکھا۔ ندی کنارے چلتے ہوئے شیتل دھارا کا شور سنا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ سارا سنسار آنند سنگیت سے بھر گیا ہے اور پھولوں کی سگندھ جل ستھل میں رچ بس گئی ہے اور اس نے جانا کہ اسے دستو گیان مل رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ آتم گیان اپنی جگہ مگر آدمی کو دستو گیان بھی ملنا چاہیے۔

دستو گیان میں مگن اور آنند سے بھرپور وہ ڈگر ڈگر چلتا رہا، دیکھتا رہا، سنتا رہا، چھوتا رہا، سونگھتا رہا۔ اسی چلنے پھرنے میں اُسے ایک پیڑ دکھائی دیا "ارے یہ تو املی کا پیڑ ہے" وہ ٹھٹھک گیا۔ اسے اچنبھا ہوا کہ اس نے کتنے دنوں سے اس جنگل میں باس کر رکھا ہے مگر اسے پتہ ہی نہ چلا کہ یہاں املی کا پیڑ بھی ہے پھر اسے یہ دھیان کر کے اچنبھا ہوا کہ اپنے نگر سے نکلنے کے بعد اس نے

کتنے پیڑوں کی چھاؤں میں بسیرا کیا ہے۔ مگر کبھی املی کا پیڑ دکھائی نہ دیا میں نے دھیان نہیں دیا تھا یا ان نبوں میں املی کا پیڑ ہوتا ہی نہیں اور یہ سوچتے سوچتے اس کا دھیان پیچھے کی طرف گیا۔ املی کا اونچا گھنا پیڑ، کمان کی سمان لمبی لمبی کٹاریں، تیز تیز اترتی طوطوں کی ڈاریں۔ جاڑوں کی رت میں بھور بھئے طوطوں کی لمبی لمبی ڈاریں شور کرتی آتیں اور اس پیڑ پہ اترتیں۔ میں نے اس کے بعد بہت بن دیکھے، پر کبھی ایسا ہرا بھرا پیڑ نہیں دیکھا اور کبھی کسی پیڑ پہ اتنے طوطے اترتے نہیں دیکھے۔ اور پھر اس پیڑ کے ساتھ اُسے تھوڑا تھوڑا کر کے بہت کچھ یاد آیا۔ آس پاس پھیلے ہوئے اونچے نیچے مٹی میں اَٹے رستے۔ ان پر دوڑتی گرد اڑاتی رتھیں۔ پیڑوں پہ دوڑتی گلہریاں گرگٹ اس کا قمچی لے کر گلہری کے پیچھے بھاگنا، گلہری کا اچک کر پیڑ پر چڑھنا، ٹہنی پہ جا کر دو ننھی ننھی ٹانگوں پہ کھڑے ہو کر اُسے دیکھنا اور پھر تیوں میں چھپ جانا کسی بھٹ میں سے دو موتیوں جیسی زبان کے ساتھ ایک لال لال منہ کا اچانک دکھائی دینا اور اوجھل ہو جانا اور اس کے سارے بدن میں ڈر کی ایک لہر کا سرسرانا اور وہاں کو شمبھی اسی پیڑ تلے شام کے جھٹپٹے میں وہ اس سے ملی تھی ایسے جیسے ندی ساگر سے ملتی ہے۔ پہلے ہونٹ ملے، پھر وہ ڈالی کی طرح کی لچکتی لمبی باہیں اس کے گردن کے گرد گئیں اور آن کی آن میں وہ دونوں شام کے جھٹپٹے سے رات کے اندھیرے میں چلے گئے۔ یہ دھیان کرتے کرتے اس کے اندر ایک مٹھاس گھلتی چلی گئی مانو اس نے سوم رس پیا ہو "وشنو گپت"، اس نے من ہی من میں کہا اور ایک آنند میں ڈوب گیا۔

اس آنند میں وہ تنک دیر رہا۔ پھر بیاکل ہو گیا۔ اور اس نے سوچا کہ سب بھکشو پیڑوں کی چھاؤں سے نکل کر بستیوں کے پیچھے چلے گئے اور کھاٹوں پہ سونے لگے اور ناریوں سے آنکھ ملا کر باتیں کرنے لگے۔ اور وہ اکیلا بن میں بھٹکتا پھر رہا ہے سب پلٹ کر اپنے اپنے استھانوں پر چلے گئے۔ میں کیوں اپنے پیڑ سے دور ہوں۔ پیڑ کی یاد اس کے لیے بلاوا بن گئی اس کے پاؤں اس ڈگر پر پڑ لیے جو اس جنگل سے نکل کر اس کے نگر کی طرف جاتی تھی۔

جنگل سے نکلتے نکلتے وہ ایک دم ٹھٹکا۔ ایک پرسینھ مورتی اس کے دھیان کا رستہ کاٹ

رہی تھی اور وہ اپدیش جیسے وہ بھول ہی گیا تھا کہ ہے بھکشوؤ! اپنے وچاروں کی دیکھ بھال رکھو اور اگر تم برائی کے رستے پر پڑ جاؤ تو اپنے آپ کو وہاں سے ایسے نکالو جیسے ہاتھی دلدل سے نکلتا ہے۔ اس نے آگے اٹھتے ہوئے پاؤں کو روکا اور ایسے پلٹا جیسے ہاتھی دلدل سے نکلتا ہے۔

وہ ایک پچھتاوے کے ساتھ پلٹ کر آیا اور ایک پیپل کے پیڑ تلے بیراسن مار کر بیٹھ گیا۔ وہ پچھتایا یہ سوچ کر کہ وہ کھلتے پھولوں اور بہتی ندی کو دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ کیا تتھاگت نے نہیں کہا تھا کہ بھکشوؤ ہنسنا مسکانا کس کارن اور خوشی کس بات کی کہ سنسار تو ہر دم دہک رہا ہے۔ اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ اس نے جانا کہ یہ سنسار اگن کنڈ ہے۔ ہر چیز جل رہی ہے۔ پھول، پتے پیڑ، بہتی ندی، اور اس کی اپنی درشٹی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ دنوں بیراسن مارے، آنکھیں موندے، گم سم بیٹھا رہا۔ پر اسے شانتی نہیں ملی۔ اس کا دھیان بار بار بھکشا اور املی کے پیڑ کی طرف چلا جاتا۔ نراش ہو کر وہ اٹھا اور شانتی کے کھوج میں ایک لمبی یاترا کی۔

ایک جنگل سے دوسرے جنگل میں، دوسرے جنگل سے تیسرے جنگل میں، چلتے چلتے اس کے تلوے خونم خون ہو گئے اور پاؤں سوجھ گئے اور ٹانگیں دکھنے لگیں۔ آخر کو وہ اردبلو کے جنگل میں جا نکلا۔ وہ سہج سہج کر کے بودھی درم کے پاس گیا۔ اس اونچے گھنے برگد کو دیکھا جو ایک دنیا سمان پیڑوں کے بیچ کھڑا تھا۔ وہ اس پیڑ کے نیچے بیراسن مار کے بیٹھا، ہاتھ جوڑ کر بنتی کی کہ ہے شاکیہ منی ہے تتھاگت ہے امی تابھ، یہ بھکشو تیرا کھویا ہے اور رستے میں ہے۔" آنکھیں موند لیں اور بڑبڑایا: "شانتی شانتی، شانتی۔"

بیٹھا رہا، بیٹھا رہا۔ دن بیتتے چلے گئے اور وہ پتھر بنا بیٹھا رہا۔ پھر ایسا ہوا کہ دھیرے دھیرے شوک اس کے جی سے ڈھل گیا۔ من میں آنند کی ایک کونپل پھوٹی اور دھیان میں ایک ہرا بھرا پیڑ ابھرا۔ وہ پیڑ وہی املی کا پیڑ تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ جانا کہ اس نے بھید پا لیا ہے۔ سبھی کہ ہر نر ناری کا اپنا جنگل اور اپنا پیڑ ہوتا ہے۔ دوسرے جنگل میں ڈھونڈنے والے کو کچھ نہیں ملے گا۔ چاہے

وہاں بودھی درم ہی کیوں نہ ہو۔ جو ملے گا اپنے جنگل میں اپنے پیڑ کی چھاؤں میں ملے گا۔

یہ بھید پاکر دریا ساگر نے جانا کہ اس نے گیان کی مایا پالی۔ اور چلا اپنے پیڑ کی اور۔ پر اردبلو کے جنگل سے نکلتے نکلتے ایک بھاونا نے اس کے پیر پکڑ لئے۔ ہے دریا ساگر یہ تو نے بھید پایا ہے یا تجھے مارے بہکایا ہے۔ وہ ایک دبدا میں پڑ گیا کہ ڈنڈی اس کے دانتوں میں ہے یا دانتوں سے چھوٹ گئی ہے۔ اس دبدا میں اس کا ایک پاؤں اردبلو کے جنگل میں تھا اور دوسرا پاؤں اپنے پیڑ کی طرف اٹھا ہوا تھا اور اگن کنڈ میں چاروں اور آگ دہک رہی تھی۔



# پتّے

اگلے دن وہ پھر اسی گلی میں گیا اور اسی دوارے کھٹکھٹایا۔ پھر وہی کومل پیروں والی ڈیوڑھی پہ آئی اور پھر اس نے نیچی نظروں کے ساتھ بھکشا پاتر آگے کر دیا اور بھکشا لے کے چلا گیا۔ یہی اُس کا نیم تھا کتنی ڈیوڑھیوں سے کتنی ناریوں کے ہاتھوں سے اس نے بھکشا لی تھی مگر کبھی نظر اٹھا کے کسی کو نہیں دیکھا اس نے جان لیا تھا کہ پنج اندریوں میں آنکھ سب سے زیادہ پاپی ہے۔ جو دکھائی دیتا ہے وہ سب مایا کا جال ہے۔ دیکھنے والا مایا کے جال میں پھنستا ہے اور دکھ اٹھاتا ہے سو آنکھ دکھ دیتی ہے۔ سو مت دیکھو اور مت پھنسو اور مت دکھ اٹھاؤ۔ سو وہ نہیں دیکھتا تھا کہ بھکشا کس ہاتھ سے مل رہی ہے۔ سو اس نے یہاں بھی نہیں دیکھا کہ بھکشا دینے والی کون ہے کیسی اس کی مورت ہے بس اُجلے کومل پیر اس کی جھکی نظروں کے سامنے پل بھر کے لیے آتے اور اوجھل ہو جاتے۔ وہ اس ڈیوڑھی پہ ایک دن آیا دو دن آیا اور آتا چلا گیا کہ بھکشا اس ڈیوڑھی سے بہت شردھا کے ساتھ ملتی تھی۔

وہ بسنت پنچمی کا دن تھا۔ گلی گلی دوارے دوارے پیلی ساڑھیاں لہرا رہی تھیں مانو سرسوں کھیتوں میں نہیں گلیوں میں پھولی ہے اور گیندا کیاریوں میں نہیں ڈیوڑھیوں میں مہکا ہے اس نے

آج پھر اسی دوار سے جا کے سانکل بجائی اور پھر کومل پیروں والی ڈیوڑھی پہ آئی۔ پر آج ان پیروں میں مہندی لگی تھی۔ اس نے جھکی نظروں سے ان پیروں کو دیکھا اور اچنبھا کیا کہ گورے پیروں میں مہندی کیسی رچتی ہے اور پیر کیا سے کیا بن جاتے ہیں۔ وہ اچنبھے سے مہندی رچے گورے کومل پیروں کو تکنے لگا۔ یہ دھیان ہی نہ رہا کہ اسے بھکشا بھی لینی ہے۔

"بھکشو جی! جلدی کرو تیوہار کا دن ہے" اور اس آواز کے ساتھ کہ یہ آواز آج اس نے پہلی بار سنی تھی بھکشا پاتر کے ساتھ ساتھ اس کی نظریں بھی اٹھ گئیں۔ اور پھر اٹھی ہی رہ گئیں۔ کیا موہنی مورت تھی۔ مکھ چندرما جیسا، بال گھٹا سے آنکھیں مرگ کی سی، گردن مورنی کی سی۔ چھاتیاں ناشپاتیاں، گات بھری بھری، کمر پتلی پتلی، ساڑھی لپیٹتی، ماتھے پہ لال بندی۔ وہ سُدھ بدھ کھوئے ٹکٹکی باندھ، اسے تکنے لگا۔ وہ سندری ایسی ہڑبڑائی کہ بھوجن سے بھری تھال ہاتھ سے گر پڑی۔

سنجے اس شبھ دن خالی پاتر کے ساتھ اپنے استھان پر واپس آیا۔ من کو ایک چنتا لگ گئی تھی۔ کیا مجھے موہ نے آگھیرا ہے۔ بہت وچار کیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا جیسے اس کی مت ماری گئی ہو۔ آنند کے پاس پہنچا اور بولا کہ "پربھو! میں بیاکل ہوں"۔

آنند نے اسے دیکھا جیسے ٹٹول رہا ہو "کارن؟"

"ناری۔"

"ناری؟"

"ہاں ناری" اور سنجے نے اپنی ساری بپتا کہہ سنائی۔

آنند اچنبھے کے ساتھ آنکھیں کھولے اس کی بپتا سنتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں موند لیں آنکھیں موندے چپ بیٹھا رہا۔ پھر آنکھیں کھولیں اور بولا "بندھو! گلیاں اور ڈیوڑھیاں موہ کا جال ہیں۔ بھکشوؤں کا نیم یہ ہے کہ وہ گلیوں میں رُکتے نہیں اور ڈیوڑھیوں میں ٹھہرا نہیں کرتے۔ گلی گلی، دوارے دوارے پھرتے ہیں، بھکشا آج یہاں سے کل واں سے۔ پر مورکھ تو نے اس نیم کا پالن نہیں کیا تو نے وہی کیا جو سندر سمدر نے کیا تھا"۔

"سندر سمدر نے کیا کیا تھا؟"

"تو نہیں جانتا سندر سمدر نے کیا کیا تھا؟"

"نہیں پربھو، میں نہیں جانتا کہ سندر سمدر نے کیا کیا تھا"

تب آنند نے سیجے کو سندر سمدر کی کہانی سنائی۔

## سندر سمدر کی کہانی

"جنم اشٹمی کا دن تھا۔ سہانی رت منگل سمے، بھادوں کی رم جھم ہو رہی تھی۔ ایک حویلی میں ایک بڈھا بڑھیا دھاروں دھار رو رہے تھے۔ ایک کنجنی ادھر سے گزری تو اس نے اچرج کیا ہے دکھیارو! تم پر کیا بپتا پڑی ہے کہ آج جنم اشٹمی کے دن جب ہر نر ناری بوڑھا بالک انسب مناتا ہے تم آنسوؤں کی گنگا جمنا بہا رہے ہو۔"

وہ دکھ سے بولی "اری ہمارے لیے نہ اب جنم اشٹمی ہے نہ ہولی دیوالی ہے۔ پوت کے بچھڑنے کا دکھ ایسا لگا ہے کہ ہر گھڑی اسے یاد کرتے ہیں اور روتے ہیں"

"پوت بچھڑ گیا؟"

"اری ہمارے ایک ہی تو پوت تھا وہ ہم سے بچھڑ گیا اور ہماری دنیا اندھیر کر گیا۔"

"کیسے بچھڑ گیا؟"

"ایک دن بدھ دیو کا اس نگر سے گزر ہوا۔ ان کے اپدیش نے اسے ایسا بدلا کہ کہاں تو چھیلا بنا پھرتا تھا اور کہاں یہ کہ سر منڈایا، پیلا بانا پہنا اور شاکیہ منی کے پیچھے ہو لیا۔"

"اس پوت کا نام کیا ہے؟"

"سندر سمدر"۔

"اچھا میں تمہارے پوت کو واپس لاؤں گی۔"

"اری تو کیسی بات کرتی ہے۔ شاکیہ منی کے سنگھ میں جا کے کون واپس آیا ہے؟"

کنجنی نے تاؤ کھایا۔ بولی "وہ اپنے سمے کا منی ہے تو میں بھی اپنے سمے کی کنجنی ہوں"۔

یہ کہہ وہ وہاں سے چلی۔ شانگیہ منی کا آنا پتا لیا کہ ان دنوں کہاں براجتے ہیں اور کس نگر میں ان کے بھکشو بھکشا لینے پہنچتے ہیں۔ اسی نگر پہنچ ایک اونچی حویلی لے وہاں رہ پڑی۔ سندر سمدر ہر روز بھکشا پاتر لے بستی میں پہنچتا، کبھی اس گلی میں کبھی اُس گلی میں۔ ایک روز اس گلی میں آیا اور اس اونچی حویلی کی ڈیوڑھی پہ پہنچا۔ وہ کنچنی تو باٹ ہی دیکھ رہی تھی۔ تھال لے کے خود ڈیوڑھی پہ آئی۔ ایسی چترائی سے بات کی اور بھکشا دی کہ سندر سمدر نے اگلے دن پھر اسی گلی کا پھیرا لگایا اور اسی ڈیوڑھی پہ آئی۔ پھر وہ اس ڈیوڑھی سے ایسا ہلا کہ دوارے دوارے جانا چھوڑا۔ روز اس ڈیوڑھی پہ جا کھڑا ہونا اور بھکشا پاتر بھروا کے لوٹتا۔ ایک دن چترائی سے کہنے لگی کہ "بھکشو جی، تمہارے نیم میں کوئی فرق نہ پڑے تو آج یہیں پدھارو اور بھوجن کرو۔ میں جانوں گی کہ میری کٹیا کو چار چاند لگ گئے"۔

سندر سمدر نے وچار کیا۔ پھر دل میں کہا کہ تتھاگت نے کبھی کسی کو نانہیں کیا۔ ایک مورکھ نے ان کے سامنے بھوجن کے نام ماس لا کے رکھ دیا۔ اس پہ بھی نانہیں کہا اور ماس کھا لیا۔ مجھے بھی یہی نیتی اپنانی چاہیئے۔ سو سندر سمدر نے اس دن اسی ڈیوڑھی میں بیٹھ کے بھوجن کیا۔ اس کنچنی نے دوسرے دن بھی یہی اچھا کی اور سندر سمدر نے پھر اس کی اچھا مان لی۔ بس سندر سمدر روز ہی اس ڈیوڑھی میں بیٹھ کے بھوجن کرنے لگا۔

سندر سمدر کو اپنی ڈیوڑھی پہ بلا لینے کے بعد اس کنچنی نے گلی کے بالکوں کو بہلایا پھسلایا اور سکھلایا کہ جب بھکشو جی ڈیوڑھی میں بیٹھ کے بھوجن کریں تو تم گلی میں خوب دنگا کرنا اور دھول مٹی اڑانا۔ میں دکھاوے کے لیے ڈانٹوں ڈپٹوں گی۔ تم بالکل مت ماننا۔ اگلے دن ان بالکوں نے یہی کیا۔ کنچنی نے بالکوں کو ڈانٹا ڈپٹا، مگر انھوں نے ایک کان سنی اور دوسرے کان اڑا دی۔ اگلے دن یہ کنچنی سندر سمدر کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑی ہو گئی، کہا کہ "پربھو جی! گلی کے بالک نگھٹ ہیں۔ گرد مٹی اڑا کے بھوجن کو خراب کرتے ہیں۔ میں بنتی کرتی ہوں کہ آپ اندر آکے پدھاریں اور بھوجن کریں"۔

سندر سمدر نے پھر بدھ نیتی کو یاد کیا اور کنچنی کی بات چپ چاپ مان لی۔ اُس دن

سے سندر سمدر ڈیوڑھی سے نکل اندر دالان میں بیٹھ کے بھوجن کرنے لگا۔ وہ بھوجن کرتا اور کنچنی اس کی سیوا کرتی۔ سیوا کرتے کرتے چھب دکھلاتی۔ کیا اس کنچنی کی چھب تھی اور کیا روپ تھا۔ صورت سرخ سفید جیسے سیب انار، چٹیا ناگن جیسی، بھویں کمان سی، گول گدرائی چھاتیاں، کمر پتلی، کولہے بھرے بھرے۔ سندر سمدر جب اس کی اور دیکھتا تو جی اس کا ڈولنے لگتا۔

تتھا گت نے اپنے گیان سے جانا کہ ان کا ایک بھکشو کس گت میں ہے۔ ان دنوں تتھا گت نے اپنے پورے سنگھ کے سنگ سراوستی کے باہر اناتھ پنڈک کے باغ میں باس کیا تھا۔ سب سنگھی اپدیش سننے کے لئے اکٹھے ہوئے۔ تتھا گت ایک گھنے آم تلے بیر اسن مار کر بیٹھے اور آنکھیں موند لیں کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں۔ سنگھیوں کو تکا، پھر ان کی گیان بھری نظریں سندر سمدر پہ آکے ٹھہر گئیں ٹکٹکی باندھ کے اسے دیکھتے رہے۔ پھر بولے "سنگھی! تیرا من کس کارن اچاٹ ہے؟"

سندر سمدر نے سر جھکا لیا اور رکتے رکتے بولا "ہے تتھا گت، موہ کے کارن۔"

تتھا گت ٹکٹکی باندھے اسے دیکھا کئے۔ پھر بولے "بھکشو! موہ میں دکھ ہے کامنا آدمی کی درگتا کرتی ہے۔ کامی آدمیوں سے وہ بندر بھلے جنھوں نے یہ بھید جان کر گرہ میں باندھا اور سکھ پایا۔"

بھکشوؤں نے پوچھا "ہے تتھا گت! وہ بھلے بندر کون تھے اور کہاں تھے؟"

"کیا تم نے بھلے بندروں کی کہانی نہیں سنی؟"

## بھلے بندروں کی جاتک

برس برس ہوئے منش جاتی سے دور پرے ہمالہ کی تلہٹی میں بندروں کی برادری رہتی تھی ایک بار ایسا ہوا کہ کوئی شکاری ادھر آنکلا۔ اس نے ایک بندر کو جتن کر کے پکڑا اور بنارس جا کے راجہ کو دے دیا۔ اس بندر نے راجہ کی ایسی چاکری کی کہ اس نے پرسن ہو کے اسے آزاد کر دیا۔ وہ بندر لوٹ کے اپنے جنگل پہنچا تو برادری اس کے گرد اکٹھی ہو گئی سب پوچھنے لگے کہ

"بندھوتوا تنے دنوں کہاں رہا؟"

"بندھوڈ! ایں منش جاتی کے بیچ رہا۔"

"منش جاتی کے بیچ؟ ...... اچھا؟ ...... پھر بتا کہ تونے اس جاتی کو کیسا پایا؟"

"بندھو! یہ مت پوچھو۔"

"ہم تو پوچھیں گے۔"

"اچھا یہ بات ہے تو سنو کہ منش جاتی میں بھی نر مادہ ہوتے ہیں جیسے ہمارے بیچ ہوتے ہیں۔ پر ان میں نر کی ٹھوڑی پہ لمبے لمبے بال ہوتے ہیں اور مادہ کی چھاتیاں بڑی بڑی ہوتی ہیں، اتنی بڑی کہ تھل تھل کرتی ہیں۔ تھل تھل چھاتیوں والی ٹھوڑی پہ بال والوں کو موہ میں پھنساتی ہے اور دکھ دیتی ہے۔"

بندروں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ چلائے "بندھو بس کر ہم نے بہت سن لیا۔" پھر وہ اس ٹیلے سے یہ کہہ کے اٹھ گئے کہ ہم نے یاں بیٹھ کے برائی کی بات سنی ہے۔ اب یاں سے اٹھ جانا چاہیے۔

تتھاگت یہ جاتک سنا کے چپ ہوئے۔ پھر بولے "بھکشوؤ! سنانے والا بندر میں تھا سننے والے بندر وہ تھے جو آج میرے بھکشو ہیں۔"

ایک بھکشو نے اچنبھے سے پوچھا کہ "ہے تتھاگت ناری مرد کو کیسے دکھ دیتی ہے جب کہ مرد بلوان ہے اور وہ نربل ہے؟"

تتھاگت مسکائے "بھولے بھکشوؤ! ناری نربل ہے تو کیا ہوا۔ چاتر جو ہوئی اپنی چترائی سے بلوانوں کے بل نکال دیتی ہے کیا تم نے چاتر راجکماری کی جاتک نہیں سنی؟"

"نہیں تتھاگت۔"

"تو سنو۔"

# چاتر راجکماری کی چاتک

بیتے سمے کی بات ہے کہ بنارس میں ایک راجہ تھا جس نے تکشیلا جا کے ودیا حاصل کی۔ بہت ودھوان، بہت بدھیمان۔ اس کے ایک پتری تھی۔ یہ سوچ کر کہ بیٹی خراب نہ ہو جائے وہ اس پر بہت کڑی نظر رکھتا تھا۔ پر ناری کو سات تالوں میں بھی رکھو تو وہ خراب ہو کے رہتی ہے۔ راجہ نے بہت چوکسی کی مگر راجکماری کے نین ایک رسیا سے لڑ گئے۔

نین تو لڑ گئے پر ملنے کی صورت نہیں نکلتی تھی کہ محل میں چوکی پہرہ بہت تھا۔ رسیا نے اپنی دایہ کو اپنا بھیدی بنایا اور محل میں بھیجا۔ دایہ محل میں جا کر راجکماری کی چاکر بن گئی۔ سانتھ ہی تاک میں رہی کہ موقع ملے تو راجکماری سے بھید کی بات کی جائے۔ ایک دن کی بات ہے کہ وہ بیٹھی راجکماری کے سر میں جوئیں دیکھ رہی تھی۔ جوؤں کو کریدتے کریدتے اس نے ناخن سے سر کو کھجایا۔ راجکماری بھی اڑتی چڑیا کو پکڑتی تھی۔ بھانپ لیا کہ دال میں کالا کالا ہے۔ بولی "اری منہ سے پھوٹ کہ اس نے کیا کہا ہے"۔

دایہ نے حوصلہ پکڑا۔ کہا "پوچھتا ہے کیسے ملوں؟"

بولی "یہ کونسی بڑی بات ہے۔ سدھا ہوا ہاتھی، کالی گھٹا، نرم کلائی"۔

دایہ نے راجکماری کا کہا رسیا کو جا سنایا۔ رسیا بھی کھیلا کھایا تھا۔ سب اشارے سمجھ گیا۔ ایک ہاتھی کو سدھایا، ایک نرم سے لڑکے کو ملایا۔ جب ساون کے دن آئے اور کالی گھٹائیں گھر کر آئیں تو رات پڑے ہاتھی پر بیٹھ لڑکے کو ساتھ بٹھا محل کی دیوار تلے جا پہنچا۔ ادھر راجکماری نے راجہ سے کہا کہ مہاراج! کیسی سندر ورشا ہو رہی ہے۔ میں تو اس ورشا میں اشنان کروں گی۔

راجہ نے بہت بہلایا پر وہ نہ مانی۔ اشنان کے لئے مینہ میں نکلی اور اس منڈیر پہ جا بیٹھی جس کے برابر رسیا ہاتھی پر سوار بیٹھا تھا۔ راجہ نے یہاں بھی چوکسی کی۔ اس کے پیچھے پیچھے مینہ میں گیا۔ جب وہ کپڑے اتارنے لگی تو اس نے منہ پھیر لیا پر راجکماری کی کلائی کو پکڑے رہا۔ راجکماری بھی بلا کی بنی ہوئی تھی۔ اس نے انگیا کھولنے کے بہانے کلائی راجہ کے ہاتھ سے چھڑائی۔ پھر گھڑی بھر بعد لڑکے کی کلائی راجہ کے ہاتھ میں پکڑا دی اور خود منڈیر سے کود ہاتھی پہ بیٹھ گئی پھر یہ جا وہ جا۔

اندھیرے میں راجہ کو کچھ پتہ نہ چلا کہ کیا ہو گیا۔ اور پھر یوں بھی اس نے منھ پھیر رکھا تھا۔ بس اسی طرح منھ پھیرے کلائی پکڑے واپس ہوا۔ راجکماری کی اٹاری میں اسے دھکیل آگے سے سانکل لگا دی۔ جب صبح ہوئی تب پتہ چلا کہ راجکماری نورسیا کے ساتھ بھاگ گئی۔ راجہ نے ہار کے کہا کہ ناری کی چوکسی کٹھن کام ہے۔ کلائی پکڑ لو تو بھی چل دے جاتی ہے۔"

تتھاگت جاتک سنانے کے بعد چپ ہوئے پھر بولے "بھکشو! جانتے ہو وہ راجہ کون تھا وہ راجہ میں تھا کہ پچھلے جنم میں راج گدی پر بیٹھا تھا اور ایک میری پتری تھی۔" چپ ہوئے۔ پھر ٹھنڈا سانس بھر کے بولے "میں نے پراکرتی کے بھید جانے پر ناری کے بھید بھاؤ نہیں جان پایا۔"

سندر سمدر جیسے سوتے سے جاگ اٹھا۔ ناری کے چکر کو جانا اور اس چکر سے نکلنے کی ٹھانی۔ من میں کہا کہ آج میں اس ناری سے کہہ دوں گا کہ کل سے میری باٹ نہ دیکھیے۔ یہ پرتگیا کر کے وہ اس ڈیوڑھی پر پہنچا۔ کنجنی نے روز کی طرح اس کی آؤ بھگت کی اور اندر لیجا کے دالان میں بٹھایا۔ پر آج اس کے سکھلائے ہوئے بالکوں نے ڈیوڑھی کے اندر آ کے دھما چوکڑی شروع کر دی۔ اس رنڈی نے پہلے تو بالکوں کو ڈانٹا پھٹکارا، پھر جب وہ نہ مانے تو سندر سمدر سے کہا کہ "بھکشو جی! یاں یہ بالک ردل مچاتے ہیں اور تمہیں ستاتے ہیں۔ اچھا ہو کہ اوپر کوٹھے پہ چل کے بھوجن کرو۔"

سندر سمدر یہ سن کر پہلے تو رکا۔ پھر سوچا کہ لوگ بالک سمان ہیں ان کی اچھا پوری کرنی چاہیئے۔ یہی بدھ نیتی ہے اور یوں بھی آج اس گھر میں میرا آخری بھوجن ہے۔ کل میں کہاں اور یہ گھر کہاں بس یہ سوچ کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آگے آگے کنجنی پیچھے پیچھے وہ۔ وہ سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ اپنے پیروں پر نظریں جمائے ایک ایک سیڑھی چڑھ رہا تھا۔ اس نے کہاں یہ دھیان دیا کہ آگے کون چل رہا ہے۔ مگر آگے جاتے والی کئی بار رک کے کھڑی ہو گئی جیسے وہ تھک گئی ہو اور ہر بار سندر سمدر بے دھیانی میں ایک نرم نرم سامنے کے سے تھ چھو گیا۔

سیڑھیاں چڑھ کے کنجنی نے سندر سمدر کو ایک سجی بنی اٹریا میں لے جا کے نرم سیج پہ بٹھلا دیا۔ پھر آپ بھی برابر میں یہ کہہ کے لیٹ گئی کہ سیڑھیاں چڑھ کے میں تو تھک گئی اور ارے مرے بند ھو

ناری کے پاس مرد کو پھسلانے کے چالیس گر ہیں۔ وہ کبختی ان چالیسوں گروں میں پوری ہوئی تھی اس نے پہلے تو ایک لمبی انگڑائی لی۔ انگڑائی لیتے ہوئے باہیں کہ ننگی تھیں اوپر اٹھائیں۔ پھر شرما کے مسکا کے گرا دیں۔ پھر ناخن سے ناخن کھرچنے لگی۔ پھر دانتوں میں ساڑھی کا پلو دبا کے لجائی بلا کسی کارن کے زور سے ہنسی، پھر ایک دم سے ہاتھوں میں منھ چھپا لیا۔ آپ زور زور سے بولی۔ پھر ایسے ہولے ہولے بولی جیسے کانا پھوسی کر رہی ہو۔ پہلے دور سمٹ کے بیٹھی، پھر وہ بلیسوا پھر کے بیٹھ گئی۔ چھاتیوں سے پلو ڈھلکایا پھر اوپر سرکا لیا۔ رانوں سے ساڑھی سرکائی پھر جلدی سے نیچے کر لی۔ اور ایک بار تو ایسی انگڑائی لی کہ بندا کھل گیا۔ پھر وہ جلدی سے سمٹ گئی ایک بار ہونٹ ہونٹوں کے پاس لے آئی، پر پھر شرما کے لجا کے پیچھے ہٹ گئی۔ اور اے مرے بندھو سندر سمدر تو بالکل موہت ہو گیا بھولا کہ وہ بھکشو ہے اور وہ تو پہلے ہی سے گرمائی ہوئی تھی۔ اسے گرماتا دیکھ کے کھل کھیلی لے جانے نہ اپنے بدن پہ کوئی دھجی رہنے دی اور نہ اس کے تن پہ دیکھتے دیکھتے سینہ سے سینہ رانوں سے رانیں بھڑانے لگی تھیں۔

آنند چپ ہو گیا۔ سنجے تڑپ کے بولا " پھر کیا ہوا؟

" پھر کیا ہوا؟" آنند ہنسا " تتھاگت بیراسن باندھے آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ انہیں خوب دکھائی دے رہا تھا کہ باغ سے دور شراوستی کی اس اونچی حویلی کی اٹریا میں مار ایک بھکشو کے ساتھ کیا چھل فریب کر رہی ہے۔ منے کی نوبت آ گئی تھی۔ بدن بس گڈمڈ ہونے لگے تھے کہ امی تابھ نے اس اٹریا میں اپنا درس دکھایا۔ سندر سمدر کی بسری سدھ واپس آئی۔ بس کام ندی میں ڈوبتے ڈوبتے باہر نکل آیا۔

آنند کہانی سنا کے چپ ہو گیا۔ ادھر سنجے وچاروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا کہ وہ کیسا منگل سمے تھا کہ تتھاگت ہمارے بیچ براجتے تھے۔ کوئی اگیانی نار کے چھل میں آ جاتا تو وہ اسے جوتی دکھاتے اور سنبیہ پتھ پہ لے آتے۔" چپ ہوا پھر بولا " مجھے نار کے چھل سے کون بچارے گا۔"

آنند بولا "ہے سنجے بیں تجھ سے وہی کہتا ہوں جو امی تابھ نے مجھ سے کہا تھا کہ آنند تو اپ آپ اپنا دیپ بن۔"

سنجے نے یہ سن کر وچار کیا پھر کہا کہ میں آپ اپنا دیپ بنوں گا۔ سو دوسرے دن جب وہ بھکشا پانے کے بستی کی اور چلا تو پرتگیا کی کہ وہ اس گلی میں نہیں جائے گا۔ پر جب وہ بستی میں داخل ہوا تو اس نے کیا دیکھا کہ یہ رستہ اسی گلی کی اور جا رہا ہے جس رستے پہ چلتا لگتا کہ وہ رستہ اسے اسی گلی میں اسی ڈیوڑھی پر لئے جا رہا ہے۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ بھیلی ہوئی نگری آج کتنی سمٹ گئی تھی۔ اس نگر کی ایک گلی اس کی کھوندی ہوئی تھی۔ ہر گلی کی ہر ڈیوڑھی سے وہ بھکشا لے چکا تھا۔ مگر آج جس گلی جس ڈیوڑھی کا اس نے دھیان کیا لگا کہ وہاں وہ ہاتھ میں تھال لیے اس کی باٹ دیکھتی ہے۔ وہ ایک بار پورے نگر کو دھیان میں لایا۔ پھر اس نے اچنبھا کیا کہ کتنی گلیاں ہیں کہ جال کے سمان پھیلی ہوئی ہیں اور گلی گلی کتنی ڈیوڑھیاں ہیں کہ ہر ڈیوڑھی میں کوئی ناری بھکشا دینے کے لیے کھڑی ہے گلیاں، ڈیوڑھیاں، ناریاں، اس نے سوچا کہ یہ سب مایا کا جال ہے پھر وہ ان بھلے بندروں کو دھیان میں لایا جنھوں نے ناری کی بات سن کے کانوں میں انگلیاں دے لی تھیں اور اس استھان کو چھوڑ دیا تھا جہاں انھوں نے یہ بات سنی تھی مجھے بھی یہ نگر چھوڑ دینا چاہیے اور وہ نگر سے منھ موڑ کے جنگل کی اور ہو لیا۔

گلیاں، ڈیوڑھیاں، ناریاں سب پیچھے رہ گئی تھیں۔ سنجے اب گھنے جنگلوں میں چل رہا تھا چلتے چلتے اس نے پھولے ہوئے ایک اشوک کے پیڑ کو دیکھا اور رک گیا۔ اس پیڑ کے نیچے اس نے نرجن باس کیا۔ بسنت رت تھی۔ سرسوں پھولی ہوئی تھی، گیندا مہک رہا تھا۔ اشوک کی ڈالیاں اپنے ہی بوجھ سے جھکی ہوئی تھیں سنجے یہ سماں دیکھ کے بہت پرسن ہوا اشوک کو دیر تک دیکھا کیا۔ پھر وہ اچنبھے سے من ہی من میں کہنے لگا کہ ہے رام کس کنیا نے اس اشوک کو ٹھوکر ماری ہے کہ وہ اتنا پھولا ہے۔ بس اس وچار کے ساتھ اس کا دھیان مہندی والے اجل کومل پیروں کی اور چلا گیا۔ کیا اس اشوک کو ان مہندی والے اجل کومل پیروں نے ٹھوکر ماری ہے وہ سندری بسنتی ساڑھی میں

لیٹی اس کے دھیان میں ابھری۔ تھوڑی دیر تک وہ اس دھیان میں ایسے ڈوبا رہا کہ کسی بات کی سدھ بدھ ہی نہ رہی۔ مگر پھر اچانک وہ چونکا۔ یہ تو میں پھر موہ کے پھندے میں پھنس رہا ہوں۔ وہ ترت وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس پیڑ تلے برائی کی بات میرے دھیان میں آئی ہے مجھے یہاں سے اٹھ جانا چاہیئے۔

سنجے نے پھر ایک لمبی باترا کی اور جنگل جنگل مارا پھرا۔ دن گزرے۔ مہینے بیتے رُتیں چڑھیں اور اُتریں۔ ہر رُت اپنی چھب مہک کے ساتھ آئی اور بیت گئی۔ ہر رُت سنجے کو دکھی کر کے گئی۔ کبھی پھولتی سرسوں، کبھی بوراتے آم، کبھی ڈولتا بھنبھناتا بھونرا، کبھی منڈلاتی بھنبھیری، کبھی دکھیا کوئل کی پکار، کبھی اداس دادر کی جھنکار، کبھی چمپا کی مہکار، کبھی بیلے کی باس، تو یوں کہو کہ ہر رُت آتی اور یادوں کی شانت ندی میں ہلکورے پیدا کر جاتی۔ ہر سہانے بیتا پل لوٹ کے آجاتا اور وہ سندر مورت سامنے آکھڑی ہوتی۔ سنجے سوچ میں پڑ گیا کہ یہاں بھی سب رستے اسی دوار کی اور جاتے ہیں۔ بہت وچار کے بعد اس نے یہ نتنت نکالا کہ رُتیں پانچ اندری سے ملی ہوئی ہیں اور پانچ اندری دکھ کے پانچ دروازے ہیں۔ آدمی موہ میں کس کس راہ سے پھنستا ہے۔ کبھی کوئی کومل پنکھڑی چھو کے، کبھی کوئی رسیلی بانی سن کے، پھر کبھی کوئی مہک اسے لے اڑتی ہے کبھی رنگ اسے لے ڈوبتا ہے۔ سو بات یوں ہے کہ ہر رُت دکھ دیتی ہے۔ یہ جان کر وہ اداس ہوا اور دکھی ہو کے کہا کہ نگر میں گلیاں ہیں اور جنگل میں رُتیں ہیں میں موہ کے جال سے کیسے نکلوں۔

سنجے انھیں وچاروں میں تھا کہ پت جھڑ آگئی۔ دن اداس ہو گئے۔ ڈول ڈول سوکھے پتے بکھرنے لگے۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ان گنت پتے ٹہنیوں سے گرتے اور جہاں تہاں تتر بتر ہو جاتے۔ اب یہ رُت مجھ سے کیا کہنے آئی ہے۔ سنجے پھر سوچ میں پڑ گیا۔ دھیرے دھیرے پھر اس کے اندر کن من ہوئی۔ اسے پھر کچھ یاد آنے لگا تھا۔ پر اب کے ایک یاد اور ہی طرح کی آئی یہی رت تھی اور ایسا ہی جنگل تھا۔ تتھاگت نے بیچ بیت جھڑ یہاں آکے باس کیا تھا۔ ادھر ادھر پیلے پیلے سوکھے پتے بکھرے پڑے تھے۔ ہاتھ بڑھا کے پتوں سے مٹھی بھری پھر آنند کو دیکھا ''آنند اکیا سب

پتے میری مٹھی میں آ گئے ہیں"۔

آنند جھجکا پھر بولا "ہے تتھاگت، یہ رت پت جھڑ کی ہے۔ پتے جنگل میں اتنے جھڑے ہیں کہ ان کی گنتی نہیں ہو سکتی"۔

تتھاگت نے کہا "آنند! تو نے سچ کہا۔ پت جھڑ کے ان گنت پتوں میں سے میں بس ایک مٹھی اٹھا سکا ہوں۔ یہی گت سچائیوں کی ہے جتنی سچائیاں میری مٹھی میں آئیں میں نے ان کا پرچار کیا۔ پر سچائیاں ان گنت ہیں۔ پت جھڑ کے پتوں کے سمان"۔

اس یاد نے اس پر نرالا جادو کیا کہ وہ جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ پھر نہ ایک قدم آگے بڑھا نہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ وہیں ایک گھنے پیپل کی چھاؤں میں آسن مار کے بیٹھ گیا اور گرتے زرد سوکھے پتوں کو تکنے لگا۔ پت جھڑ کے ان گنت پتے ان گنت سچائیاں۔ ایک حیرانی کے ساتھ وہ گرتے پتوں کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا رہا۔ دھیرے دھیرے کر کے اس کی آنکھیں مندتی چلی گئیں۔ جو باہر ہے وہی میرے اندر بھی ہے آسن مارے آنکھیں موندے بیٹھا رہا۔ بیٹھا رہا جانے کتنے دن، کتنے جگ۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو جانا کہ ان گنت رتیں بیت گئی ہیں اور اب وہ پت جھڑ میں ہے۔ اس کی گود میں زرد سوکھے پتے بھرے تھے۔ وہ زرد سوکھے پتوں میں نہایا ہوا تھا اور دھوپ میں تپ رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کے اوپر دیکھا۔ جس پیپل کو گھنا دیکھ کے وہ اس کی چھاؤں میں بیٹھا تھا اس پیپل کا ایک ایک پتہ جھڑ چکا تھا۔ پھر اس نے ارد گرد نظر ڈالی اور دور تک دھرتی کو زرد پتوں سے ڈھکا پایا۔ دور تک پیڑ لنڈ منڈ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ اس نے اپنے شانت من میں جھانکا کہ میری کامنائیں بھی زرد سوکھے پتوں کے سمان جھڑ چکی ہیں پھر اس نے کہا کہ بسنت رت، برکھا رت، جاڑے کی رت، سب رتیں آتی جاتی ہیں۔ پھول جھڑ جاتے ہیں، باس اڑ جاتی ہے ٹہنیاں سوکھ جاتی ہیں، پھر پت جھڑ امر ہے وہ مسکایا جیسے اس کی مٹھی بھر گئی ہو۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ شانت تھا۔ من میں کہا کہ میری یاترا سپھل ہوئی۔ اب مجھے واپس چلنا چاہیئے۔

سچے جنگل میں خالی یاترا بیا کل من کے ساتھ گیا تھا۔ جنگل سے بھری مٹھی اور شانت ہردے

کے رنگ لوٹا جنگل سے نکل آیا تھا۔ اب وہ بھری بستی میں تھا۔ شراوستی میں اس سمے کیسی چہک مہک تھی۔ لگتا تھا کہ نگر نہیں پھلا پھولا باغ ہے رنگ اور سوگندھ کی ندی امنڈی ہوئی تھی چہکتے پنچھی مہکتی کیاریاں، سندرناریاں رنگ رنگ کی ان کی ساڑیاں، گلیوں میں آتیاں جاتیاں۔ اس نے ایک بیراگ کے ساتھ یہ سب کچھ دیکھا۔ ایک بار جی میں آئی کہ بستی کے بیچ کھڑا ہو کے ڈھنڈورا پیٹ دے کہ ہے اگیانیو، ہے شراوستی کے باسیو! رنگ رس میں مت ڈوبو۔ پھول کمہلا جاتے ہیں۔ بو باس اڑ جاتی ہے، رنگ روپ اتر جاتا ہے، جوبن ڈھل جاتا ہے۔ سندرتا کی سب رتیں آتی جاتی ہیں بیت جھڑ امر رت ہے۔ پر من میں تو بیراگ رچ گیا تھا۔ بولنے کو اب جی کب چاہتا تھا گم سم آنکھیں جھکائے شراوستی کی گلیوں سے گزرا۔ آنکھ اٹھا کے یہ بھی نہ دیکھا کہ کس گلی میں ہو اور کس دوارے بھکشا مانگتے ہو۔ کیوں دیکھیں، مطلب تو بھکشا سے ہے۔ بیراگی کو اس سے کیا کہ کس دوارے سے ملا ہے اور کن ہاتھوں سے ملا ہے جھکی نظروں نے بس دینے والی کے پیروں کو دیکھا اور حیران رہ گئیں بالکل ویسے ہی گورے مہندی لگے پیر کیا یہ وہ ہے چونک کے نظر اٹھائی۔ کیا دیکھا کہ وہی کھڑی ہے بالکل اسی بر میں بسنتی ساڑھی، ماتھے پہ لال بندی، ہاتھوں میں بھوجن سے بھری تھال۔ اٹھی نظریں اٹھی کی اٹھی رہ گئیں۔ قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔ نہ کوئی قدم پیچھے نہ کوئی قدم آگے۔ ایک پل میں جگ بیت گئے۔ لگا کہ جنم جنم سے وہ اس ڈیوڑھی پہ اسی گت سے کھڑی ہے اور جنم جنم سے وہ اسی طرح ٹھٹھکا ہوا اسے تک رہا ہے۔

من اس کا پھر بیاکل تھا اور آتما پھر دکھی تھی۔ رت پھر بدلنے لگی تھی۔ ٹنڈ منڈ پیڑوں میں کونپلیں پھوٹ رہی تھی۔ اس نے ایک وسوسے کے ساتھ اپنے اندر جھانکا، کیا میرے بھیتر پھر کوئی کونپل پھوٹ پڑی ہے۔ اور اس نے اچنبھے کے ساتھ سوچا کہ اپنے دیپ کے اجالے میں چلتے چلتے میں کہاں آگیا ہوں اور یہ کیسے پتے ہیں کہ میری مٹھی میں آگئے ہیں۔

# واپس

"سو ہے سنگھیو! تب بدھ دیو جی نے آنکھیں کھولیں اور کہا کہ "ہے بھکشوؤ! یہ پہلی بار نہیں ہوا۔ ایسا آگے بھی ہو چکا ہے۔" بھکشو یہ سن کے سوچ میں پڑ گئے۔ پوچھا کہ "ہے تتھاگت ایسا پہلے کب ہوا تھا"

تب بدھ دیو جی نے ایک جاتک سنائی جو اس پرکار ہے کہ بنارس کے سندر نگر کے باہر ایک مرگھٹ تھا۔ جہاں بہت سے کتے رہتے تھے۔ ان میں ایک کتا ان سب کا گرو تھا۔ سب کتے اس گرو کا بہت آدر کرتے تھے۔

ایک دن کی بات ہے کہ بنارس کا راجہ اپنے رتھ میں بیٹھ کے سیر کو نکلا۔ دن بھر سیر کرنے کے بعد شام کو لوٹا۔ چاکروں نے رتھ کا سامان باہر پڑا چھوڑ دیا۔ رات کے سمے ورشا ہوئی تو سارا سامان بھیگ گیا۔ اس سامان میں رتھ کے گدے بھی تھے جن پہ چمڑا منڈھا ہوا تھا۔ یہ چمڑا بھیگ گیا۔ راج محل کے کتوں نے چمڑے کو گیلا پا کر دانتوں سے کاٹا اور کھا گئے۔

دوسرے دن راجہ تک بات پہنچی کہ کتے رتھ کے گدوں کا چمڑا کھا گئے۔ راجہ نے تاؤ کھایا اور منادی کر دی کہ کتے جہاں دکھائی دیں انہیں مار ڈالو۔ بس پھر کیا تھا، بنارس نگری

کے کتے مارے جانے لگے۔ یہ سب وہی کتے تھے جو شمشان گھاٹ میں ٹھکانا کرتے تھے جب مرنے کٹنے لگے تو اپنے گرو کے پاس جا کے اپنی بپتا سنائی اور دہائی دی کہ ہے گرو کیسا انیائے ہے کہ راج محل کے پاپی کتے نگر میں دندناتے پھرتے ہیں اور ہم شمشان گھاٹ کے باسی بنا کارن مارے جاتے ہیں۔

گرو نے یہ بات سن راج محل کی راہ لی۔ راجہ کے چاکروں نے اسے بہت دھتکارا مگر اس نے ایک نہ سنی اور سیدھا راجہ کے سامنے پہنچا اور کہا کہ "ہے منش جاتی کے راجہ! کتوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے کہ تو ان کی جانوں کا بیری ہو گیا ہے۔"

"انہوں نے میری رتھ کے گدے کاٹ ڈالے اور ان کا سارا چمڑا چبا گئے۔ سو میں نے ڈھنڈوری پٹوا دی کہ نگر میں جو کتا دکھائی دے اسے مار ڈالو۔"

"ہے راجہ! کیا یہ حکم راج محل کے کتوں پر بھی لاگو ہوتا ہے؟"

"نہیں۔ وہ میرے شرن میں ہیں۔"

"کیسا انیائے ہے کہ اپرادھی راجہ کے شرن میں ہیں۔ نردوشی مارے جاتے ہیں۔"

"اے کتے! تو نے یہ کیسے جانا کہ یہ راج محل کے کتوں کا کیا دھرا ہے۔"

"مہاراج ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، اپنے کتوں کو دودھ میں گھی اور گھاس ملا کے پلاؤ اور پھر تماشا دیکھیو۔"

راجہ نے ترت دودھ میں گھی اور گھاس ملوا کے اپنے کتوں کو پلایا۔ جو کتا وہ دودھ پیتا، ابکائی لیتا اور چمڑے کے ٹکڑے اگل دیتا۔ تب راجہ نے شمشان گھاٹ کے کتوں کو معافی دی۔ راجہ نے کتے کی سکشا کو گرہ میں باندھا اور اسے اپنا منتری بنایا۔ اور ہے بھکشوؤ! اس سکشا کا اثر ایک لاکھ برس تک رہا۔ لاکھ برس بعد راجاؤں کے لچھن پھر ویسے ہی ہو گئے۔ جیسے پہلے تھے۔

بدھ دیو جی جاتک سن کے چپ ہوئے۔ پھر بولے کہ ہے "بھکشوؤ! وہ کتا میں تھا۔"

"تم ؟" سب بھکشوؤں نے چکرا کے پوچھا۔

"ہاں ہیں، وہ راجہ انند تھا۔ کتوں کا گرو ہی تھا۔ شمشان گھاٹ کے دوسرے کتے تم تھے۔"

"ہم ؟"

"ہاں تم۔ تم نے اپنے کرموں کے کارن آگے چل کے آدمی کا جنم لیا اور پھر تم میرے سنگھی بنے۔"

"اور راج محل کے کتے ؟"

"وہ۔ وہ ابھی تک کتے ہیں۔"

اگرسین سے یہ جاتک سن کے سب بھکشو اچنبھے میں پڑ گئے اور وچار کرنے لگے۔ دیر بعد گوبند نے لمبا ٹھنڈا سانس لیا اور کہا کہ "وہ کیا منگل سمے تھا کہ ہم شمشان گھاٹ کے کتے تھے اور تتھاگت ہمارے سنگ تھے۔ ہمارے ہی کارن تو انھوں نے یہ جنم لیا تھا۔ انھوں نے کیسی جوتی جگائی تھی کہ کتے بھی آدمی بن گئے تھے۔ اور اب کہ ہم آدمی کے جنم میں ہیں۔ آدمی آدمی نہیں رہے۔ باہر سے آدمی دکھائی پڑتے ہیں، پر اندر سے ......"

اگرسین نے بات کاٹی اور کہا کہ "مترو! یہ پہلی بار نہیں ہوا۔ آگے بھی ایسا ہو چکا ہے۔"

"اگرسین! تو نے کیسے جانا کہ آگے بھی ایسا ہو چکا ہے۔"

"مترو! میں نے تتھاگت سے ایسا ہی سنا ہے۔" اور اگرسین نے ایک جاتک سنائی کہ اس طرح ہے:

یہ اس بیتے سمے کی بات ہے جب بنارس کے راج سنگھاسن پر راجہ جنسندا براجمان تھا اور راج محل میں ہمارے بدھ دیو جی کہ ابھی بدھیستو تھے راج کمار کے روپ براجتے تھے۔ روپ انوپ، صورت چندرماں ایسی۔ اس کارن انھیں سب محل کے اندر باہر ادیس مکھ کہتے تھے۔ پتا نے انھیں تینوں وید پڑھا کرائیں اور ساری ودیا پڑھا ڈالی۔ پر ابھی سانواں برس لگا تھا کہ جنسندا نے پران چھوڑے اور بیکھنٹ کو سدھارا۔ راج سنگھاسن پر اب ادیس مکھ کو بیٹھنا تھا پر بہت سے درباریوں کی نیت میں کھوٹ آ گیا۔ انھوں نے کہا کہ راج کمار جی بالی عمر کے ہیں راج کے

کام کیسے کریں گے۔ درباریوں میں بھلے لوگ بھی تھے وہ کہتے تھے کہ راج کمار نے ساتوں ودیائیں پڑھی ہیں، پرجا کے چہیتے ہیں۔ راج کرنے کے لیے اور کیا چاہیئے۔ کھوٹی نیت والوں نے کہا کہ اچھا یہ بات ہے تو ابھی پرکشا کیے لیتے ہیں، دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوا جاتا ہے وہ ایک بندر کو شال دوشالے اوڑھا کر اور دو ٹانگوں پہ چلا کر اد لیس مکھ کے سامنے لائے اور کہا کہ ہے راج کمار یہ بہت دھوان آدمی ہیں۔ راج کار لیے میں تمہاری بہت سہائتا کریں گے۔ تم انھیں اپنے منتری منڈل میں لے لو۔ بدھیستو جی نے اسے سر سے پیر تک دیکھا اور کہا کہ مترو! یہ مانس نہیں منو ہے۔ مجھے آدمیوں کی سہائتا چاہیئے۔ جہاں بندر منتری بن جائیں وہاں اس کے سوا کیا ہوگا کہ پرجا دکھی ہوگی راج چوپٹ ہو جائے گا۔

کھوٹی نیت والے اپنا سا منہ لے کے چلے گئے۔ پر دوسرے تیسرے دن وہ بھیڑ اسے آدمیوں کے بھیس میں پگڑی دھوتی بندھوا کر لائے اور کہا کہ ہے راج کمار یہ تمہارے پتا کے راج میں نیایک تھا۔ چاروں کھونٹ اس کی نیائے کا چرچا تھا۔ تم بھی اسے نیایک بناؤ اور پرجا کی اور سے نچنت ہو جاؤ۔

بدھیستو جی نے ٹکٹکی باندھ کے اسے دیکھا۔ تاڑ گئے کہ یہ آدمی نہیں بولے کہ مترو کبھی بندر بھی نیایک ہوئے ہیں۔

بس اس کے ساتھ کھوٹوں کا پول کھل گیا اور بدھیستو جی سنگھاسن پہ بیٹھ کے راج کرنے لگے۔ انہوں نے سادھو بدھ کے ساتھ راج کیا اور پرجا کو بھلائی کی سکشا دی۔ اس سکشا کا لاکھ برس تک اثر رہا۔ لاکھ برس تک لوگوں نے آدمی اور بندر کے انتر کو یاد رکھا اور امن چین سے رہے۔

اگر سین جاتک سنا کے چپ ہو گیا۔ دوسرے بھکشو بھی کہ دھیان سے جاتک سن رہے تھے چپ بیٹھے رہے۔ پھر گوبند نے سر اٹھایا اور بولا کہ دو ہے اگر سین! کیا لاکھ برس پورے ہو چکے ہیں؟"

اگر سین نے جواب دیا کہ ”اگیانی! تو دیکھتا نہیں کہ دنیا کی کیا دشا ہو گئی ہے اور لوگ کیسے مورکھ ہو گئے ہیں۔ پھر بھی تو پوچھتا ہے کہ کیا لاکھ برس پورے ہو گئے ہیں۔

گوبند بولا ”پربھو! ہم پلٹ نہ چلیں؟“

”کہاں؟“

”بنارس کے شمشان گھاٹ میں“

اگر سین نے اسے گھور کے دیکھا، کہا ”مورکھ! ہم نے لاکھ برس تک جنم جنم کے کشٹ کھینچے ہیں تب کہیں لوٹ پھیر کے آدمی بنے ہیں تو پھر ہمیں لسر ے جنم میں لے جانا چاہتا ہے“

”ہم آدمی تو بن گئے پر......“ وہ کچھ کہنے لگا تھا مگر پھر رک گیا اور ایسا رکا کہ دیر تک ایک بات بھی نہ کی۔ پر اس کے اندر ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ رہ رہ کے وہ سوچتا کہ لاکھ برس بیت گئے ان لاکھ برسوں میں، میں نے کتنے جنم لیے اور کتنے کشٹ کھینچے۔ انت میں آدمی کا جنم لیا۔ پر اس جنم میں...... یہ سوچتے سوچتے وہ دکھی ہو گیا۔

بیاکل من اور دکھی آتما کے ساتھ وہ دیر تک آنکھیں موندے گم سم بیٹھا رہا۔ اس سمے کے جنم کے دھیان نے اسے بہت دکھی اور بیاکل کر دیا تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا دھیان پچھلے جنموں کی اور گیا۔ دھیرے دھیرے اسے لگا کہ لاکھ برس سامنے آکھڑے ہوئے ہیں، اپنے ان گنت جنموں کے سنگ۔ دھیان ہی دھیان میں وہ الٹے پاؤں چلنے لگا۔ اس جنم سے پچھلے جنم میں، پچھلے جنم سے اور پچھلے جنم میں، پھر اور پچھلے جنم میں۔ دھیان ہی دھیان میں اس پہ سارے پچھلے جنم بیت گئے اور اس نے دیکھا کہ وہ بنارس کے مرگھٹ کی چوکھٹ پہ کھڑا ہے وہ چونک پڑا۔

گوبند نے آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر دیکھا۔ سب بھکشو دھیان میں گم بیٹھے تھے۔ اگر سین بیراسن مارے آنکھیں موندے دھیان ساگر میں ڈوبا تھا۔ اس آن اسے دنیا بہت اجاڑ دکھائی دی۔ بنارس کا مہا شمشان اپنے باسیوں سمیت اسکی آنکھوں میں پھر رہا تھا۔ میں مرگھٹ کا باسی مرگھٹ سے دور اس سنسار میں اجنبی ہوں۔ اس کے اندر ایک لہر اٹھی اور وہ اپنا کیسری بانا اوڑھ بھکشا

پائر سنبھال اٹھ کھڑا ہوا۔

اگربین نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ "بندھوا کدھر جانے کے دھیان میں ہے؟"

"بنارس کے مرگھٹ کی اور۔"

"بنارس کے مرگھٹ کی اور؟"

"ہاں بنارس کے مرگھٹ کی اور۔" اور وہ پیچھے دیکھے بنا جلدی جلدی چلا اور سنگھیوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔



# رات

"یار اس پہ مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا"۔

"کیا"؟

"لطیفہ یا حکایت جو کچھ بھی سمجھو۔ ایک عامل کو اس کا ہمزاد سونے نہیں دیتا تھا۔ جب اسے نیند آجاتی تو ہمزاد آن دھمکتا۔ کہ مجھے کام بتاؤ۔ عامل اسے دور دور کے کام بتاتا کبھی پورب کی طرف بھیجتا کبھی پچھم کی راہ دکھاتا۔ کبھی سات سمندر پار کی مہم پر روانہ کرتا۔ ہمزاد چشم زدن میں وہ کام انجام دیتا۔ اور پھر عین اس وقت جب اس کی آنکھ لگتی آن موجود ہوتا۔ کہ کوئی اور کام بتاؤ۔ عامل اس سے بہت دق تھا۔ آخر ایک دن اس نے جھنجھلا کر پاس کھڑے گھنگھریالے بالوں والے پالتو کتے کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ اس کے بال سیدھے کر۔ ہمزاد اس کام میں لگ گیا مگر اس کام نے اسے الجھا دیا۔ ہمزاد بار بار اس کے بال سیدھے کرتا اور بار بار وہ پھر مڑ جاتے۔ بس پھر ہمزاد رات بھر کتے کے بال سیدھے کرتا رہتا۔ اور عامل اطمینان سے سویا رہتا"۔

یاجوج یہ حکایت سن کر بہت محظوظ ہوا۔ دونوں مل کر خوب ہنسے پھر یاجوج کو کچھ خیال آیا۔

کہنے لگا۔ ''ہم تو آج بیٹھے ہوئے ایسے ہنس بول رہے ہیں جیسے ہمیں اس کے سوا کوئی کام نہیں ہے لگتا ہے۔ آج کی رات ہم ہنس بول کر ہی گزار دیں گے۔

''یاجوج'' ماجوج بولا۔ ''ہمیں کبھی کبھی یوں بھی چاہیئے۔ کہ ہمیں کم از کم یہ یاد تو رہے کہ زبان کس کام کے لئے بنی ہے۔''

یاجوج کو ماجوج کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ کہنے لگا ''ماجوج بولنا کون سی کمال کی بات ہے سب ہی لوگ جنہیں خدا نے زبان دی ہے بولتے ہیں مگر ہم بولنے سے بڑا کام انجام دے رہے ہیں۔''

''بڑا کام تو ہم انجام دے نہیں پائے۔'' ماجوج جل کر بولا۔ ''مگر اس چکر میں ہم چھوٹے کام سے بھی گئے۔''

''میرے یار تھوڑا صبر کرو۔ جو زبانیں اس دیوار کو چاٹنے کی سکت رکھتی ہیں۔ وہ بول بھی سکتی ہیں۔''

''پتہ نہیں وہ دن کب آئے گا۔ جب ہم بولنے جوگے ہوں گے۔ فی الحال تو یہی لگتا ہے تاکہ ہم پیدا ہی اس لیے ہوئے ہیں کہ اس دیوار کو چاٹتے رہیں۔ تا آنکہ موت آئے اور ہمیں چاٹ لے'' ماجوج رکا پھر بولا ''کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ہمیں موت بھی نہیں آئے گی۔ جیسے ہم اس دیوار کو ازل سے چاٹ رہے ہیں اور ابد تک چاٹتے رہیں گے۔'' یہ کہتے کہتے اس نے تامل کیا۔ پھر اچانک بولا۔ ''ہم بھی کسی عامل کے چکر میں آ گئے ہیں۔ اس نے ہمیں کتے کے بال سیدھے کرنے پہ نہیں لگایا۔ دیوار چاٹنے پر لگا دیا۔''

''یہ تو کیا کہہ رہا ہے'' یاجوج ماجوج کا منہ تکنے لگا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں'' یاجوج ماجوج یہ دیوار نہیں چکر ہے۔''

یاجوج سن کر بہت چکرایا۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ مگر جب اس نے ایک نظر دیوار پہ ڈالی تو اسے پتلا ورق پا کر اس میں پھر سے حوصلہ پیدا ہو گیا۔ ''دیکھو یار۔ اگر یہ چکر بھی ہے تو آج رات رات میں ہم اسے ختم کر دیں گے۔ تو دیکھتا نہیں کہ ابھی اول رات ہے۔ اور ہم نے دیوار کتنی چاٹ لی ہے۔''

یاجوج اٹھ کھڑا ہوا اور دیوار چاٹنے کے لیے مستعد ہوا۔ مگر ماجوج جما بیٹھا رہا۔ جمائی لیتے ہوئے بولا۔

''یار روز روز کے چکر سے میں بالکل بور ہو چکا ہوں تو دیوار کو چاٹ میں چلا۔

"تو کہاں جائے گا۔"

"بس کسی الاؤ پہ جا کے بیٹھوں گا ہاتھ تاپوں گا اور کہانی سنوں گا۔"

"یار واقعی کتنے دن ہو گئے۔ کہ ہم نہ کسی الاؤ پہ جا کے بیٹھے نہ کوئی کہانی سنی۔" ایک دم سے کتنے بھولے بسرے الاؤ یاجوج کے تصور میں زندہ ہو گئے۔ بیچ میں دہکتی ہوئی آگ، اور گرد بیٹھے ہوئے لوگ ہر عمر کے کوئی جوان کوئی بوڑھا۔ اور درمیان میں بیٹھا ہوا کوئی بزرگ کہ رات کے جادو کے ساتھ کہانی کا جادو جگا رہا ہے۔ "یار تو یہاں مجھے اکیلا چھوڑ جائے گا۔"

"پھر تو بھی چل۔"

یاجوج ڈانواں ڈول ہو گیا۔ اسے ڈانواں ڈول دیکھ کر ماجوج نے ٹہوکا "یار چھوڑ اس چوتیا چکر کو۔ چار دن کے الاؤ پہ چلتے ہیں اور آنسر سے کہانی سنتے ہیں کتنے زمانے سے ہم نے اس بزرگ سے کہانی نہیں سنی۔"

یاجوج پہ ماجوج کی بات اثر کر گئی۔ وہ اٹھنے ہی لگا تھا کہ نظر دیوار پہ جا پڑی۔ دیوار کو دیکھتے ہی اس کی نیت بدل گئی۔ "یار یہ پروگرام کل تک کے لئے ملتوی نہیں ہو سکتا۔"

"کل کیا ہو جائے گا جو آج صورت ہے وہی کل ہوگی۔"

"نہیں مجھے یقین ہے کہ آج رات ہم اس دیوار کو ضرور چاٹ ڈالیں گے۔" کل ہم بالکل فارغ ہوں گے۔

"چھوڑ یار کب سے ہم آج کل آج کل کر رہے ہیں۔ اسی آج کل ہی میں ہم نے عمر کی کتنی سہانی راتیں ضائع کر دیں۔"

"یار جہاں اتنی راتیں ضائع کی ہیں وہاں ایک رات اور سہی آج کی رات اور اس دیوار کو چاٹ کر دیکھتے ہیں۔"

"اچھا اس شرط پہ رکتا ہوں کہ بس آج کی رات اور ہم اس دیوار کو چاٹیں گے چاٹے یا نہ چاٹے کل کی رات میں یہاں نہیں لگانی۔"

"مان لی تیری شرط"

یہ طے ہو جانے کے بعد دونوں سرگرمی سے اپنی لمبی لمبی زبانیں نکال کر دیوار پہ جھک گئے۔

رات گئے تک دیوار کو چاٹنے کے بعد دونوں ایک ذرا دم کے لیے رُکے۔ یاجوج نے دیوار کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ وہ تو بالکل ورق بن گئی ہے اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ سوچا کہ بس اب تو آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ مگر ماجوج کو نیند آنے لگی۔ اس نے کہا کہ "یار یاجوج میں ذرا ایک جھپکی لے لوں۔ بہت نیند آرہی ہے"۔ یہ کہہ کے وہ بس فوراً ہی سو گیا۔ اور خراٹے لینے لگا۔ اس کے خراٹوں نے عجب اثر کیا کہ یاجوج بھی اونگھنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اب کون سا ایسا کام رہ گیا ہے۔ کیوں نہ میں بھی جھپکی لے لوں۔ اور وہ بھی سو گیا۔

یاجوج ماجوج دونوں جیسے گھوڑے بیچ کر سوئے آنکھ ان کی اس وقت کھلی جب سر پہ سورج آگیا اور انہوں نے کیا دیکھا کہ دیوار پھر اپنی ضخامت اور بلندی کے ساتھ ان کے سر پہ کھڑی ہے۔ یہ دیکھ کے ان غریبوں کا جی ڈھے گیا۔

یاجوج، ماجوج دن بھر ایسے ڈھئے پڑے رہے جیسے کوئی دیوار ڈھئی پڑی ہو۔ جب شام ہوئی تب کہیں اُن میں جان آئی۔ انہوں نے لشٹم پشٹم اپنے ہوش و حواس درست کیے۔ یاجوج نے دیوار کی طرف دیکھا اور شام کے بڑھتے اندھیرے میں وہ دیوار اسے اپنے سر پہ پہاڑ کی طرح کھڑی نظر آئی۔ مگر یہ طے ہو چکا تھا کہ اب اس دیوار کو چاٹنا نہیں ہے۔

ماجوج پھرتی سے کھڑا ہوا۔ "چلو یہاں سے چلیں"۔

"کہاں؟"

"جابروت کے الاؤ پہ چلتے ہیں۔ اب تک تو روشن ہو چکا ہوگا۔ وہاں پرانے یاروں سے ملیں گے اور ان سے کہانی سنیں گے"۔

دونوں وہاں سے اُٹھ جابروت کے الاؤ کی طرف ہو لیے۔ مگر وہاں پہنچے تو کسی کو نہ پایا۔ نہ الاؤ نہ الاؤ والے کوئی ادھ جلی لکڑی، کچھ ٹھنڈی راکھ۔ لگتا تھا کہ ایک زمانے سے یہاں الاؤ گرم

نہیں ہوا ہے۔ دونوں بہت حیران ہوئے کہ آخر یاروں پر کیا گزری۔ کہ الاؤ اب یہاں گرم نہیں ہوتا۔

دیر بعد ایک آدمی اُدھر سے گزرتا ہوا نظر آیا۔ اسے روک کر پوچھا کہ بھائی آج کی شب الاؤ گرم نہیں ہوا۔

"الاؤ؟ کیسا الاؤ؟ یہاں تو کوئی الاؤ گرم نہیں ہوتا۔

"جاروت کہاں ہے؟"

اس آدمی نے دونوں کو غور سے دیکھا "تم کب کی بات کر رہے ہو۔ جاروت نے مدت ہوئی یہ الاؤ چھوڑ دیا۔ وہ اب حویلی میں رہتا ہے اس وقت وہ آتش دان کے سامنے بیٹھا ہوگا۔"

"حویلی، وہ کیا ہوتی ہے؟"

اس آدمی نے دونوں کو پھر غور سے اور حیرت سے دیکھا۔ "تم تو بالکل جنگلی لگتے ہو۔ حویلی کو نہیں جانتے کہ کیا ہوتی ہے۔ اونچی دیواریں، موٹی چھتیں، بھاری دروازے، بس یہی حویلی ہوتی ہے۔"

"دیواریں۔ اچھا تو جاروت نے دیواریں کھڑی کر لی ہیں۔" یاجوج ماجوج حیران رہ گئے۔ پھر پوچھا "اور آشنر کہاں ہے۔"

"آشنر؟ اچھا وہ بوڑھا قصہ گو، وہ تو زمانہ ہوا مر گیا۔"

"آشنر مر گیا" یاجوج ماجوج نے تعجب سے پوچھا اور افسوس کرنے لگے۔

"اچھا آشنر کا بیٹا عمرام کہ ہمارا یار تھا کہاں چلا گیا" "ہے تو وہ یہیں مگر اس وقت فلم دیکھنے گیا تھا۔"

"فلم" ! یاجوج ماجوج ایک مرتبہ پھر متحیر ہوئے۔

آدمی ہنسا "اب تم پوچھو گے کہ فلم کیا ہوتی ہے۔"

"نہیں! اب اس کے آگے ہم کچھ نہیں پوچھیں گے۔" اور یاجوج ماجوج وہاں سے اُلٹے پاؤں پھرے اور جہاں سے چلے تھے وہیں پھر آ بیٹھے۔

"یار دنیا بہت بدل گئی ہے۔" یاجوج سوچتے ہوئے بولا۔

"یار کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔" ماجوج تلخ سی ہنسی ہنسا۔

"ہم یہاں دیوار چاٹتے رہ گئے وہاں یاروں نے نئی دیواریں کھڑی کر لیں۔ اور چھتیں پاٹ لیں۔" یہ کہتے کہتے اس کی آواز میں ایک دکھ پیدا ہوگیا۔ "ہم تو دیوار کو نہ چاٹ سکے دیوار ہی نے ہمیں چاٹ لیا۔"

"ہم نے اپنے کتنے روز و شب اس دیوار پہ صرف کئے اور دیوار ہے کہ جوں کی توں کھڑی ہے۔" اس وقت یاجوج بھی دکھی ہو رہا تھا۔

"روز و شب" ماجوج نے یاجوج کی بات کاٹی۔ "مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ہماری ساری زندگی ایک لمبی رات ہے جیسے بیچ بیچ میں صبح محض ہمارے رات کے کٹے کرائے کو اکارت کرنے کے لئے نمودار ہوتی ہے۔"

"صبح" یاجوج بدمزہ لہجہ میں بڑبڑایا اور چپ ہوگیا۔

"رات بہت ہوگئی ہے اب ہمیں سونا چاہیئے۔" ماجوج نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

یاجوج ماجوج بہت راتوں کے جاگے ہوئے تھے۔ سوچا تھا کہ لمبی تان کے سوئیں گے۔ آنکھیں دونوں کی نیند سے بوجھل تھیں۔ مگر عجب ہوا کہ لیٹتے ہی نیند غائب ہوگئی رات گئے تک وہ کروٹیں بدلتے رہے۔

"یار نیند نہیں آرہی۔" یاجوج نے ایک لمبی جمائی لی اور اٹھ کے بیٹھ گئے۔

"مجھے بھی نہیں آرہی۔" ماجوج بھی اٹھ کے بیٹھ گیا۔

یاجوج ماجوج اٹھ کے بیٹھ گئے تھے۔ نیند تو نہیں آرہی تھی۔ اب کیا کریں۔

"رات ایسے کیسے کٹے گی۔" ماجوج بولا۔ "باتیں ہی کریں۔"

"باتیں۔" یاجوج افسردہ ہوگیا۔ "دیوار کو چاٹتے چاٹتے میری زبان اتنی زخمی ہوگئی ہے کہ میں زیادہ بول نہیں سکتا۔"

ماجوج بولا۔ "میں تو روز صبح کو پھٹکری کے پانی سے غرارے کرنے کے بعد شامل جراح

کا دیا ہوا مرہم لگا لیتا ہوں میری زبان کو تو اس سے بہت آرام آجاتا ہے۔"

"وہ تو بار مَیں بھی کرتا ہوں۔ مگر یہ تو روز کا قصّہ ہے زخم بھرنے نہیں پاتے کہ نئے زخم پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں پھٹکری کے غرارے اور شامل جراح کا مرہم ہمیں کتنا فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"ویسے یار میرا خیال ہے" یاجوج سوچ کر بولا۔

"میری زبان بھی کچھ موٹی پڑ گئی ہے۔"

"جب نہیں بولو گے تو زبان موٹی ہی پڑے گی۔ ہمارا باپ کہا کرتا تھا بولتے رہو گو نگے نہ ہو جاؤ۔"

"ہے تو ٹھیک بات، مگر یار ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے۔"

"ہاں۔" ماجوج نے ایک ہلکی سی تلخی کے ساتھ کہا۔

"ہاں ایک وقت میں ایک ہی لایعنی کام کیا جا سکتا ہے۔ ماجوج نے یاجوج کے بیان میں تھوڑی سی اصلاح کر دی۔ پھر بولا۔ "یار کبھی کبھی جب میں بولتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں نہیں بول رہا۔ دیوار چاٹ رہا ہوں۔" یاجوج ماجوج کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ اسے شک تھا کہ بولتے وقت اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

"یار اب سونا چاہیئے۔" وہ افسردگی سے بولا۔

یاجوج ماجوج ایک مرتبہ پھر دراز ہوئے اور سونے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر نیند کا کوسوں پتہ نہیں تھا۔ یاجوج کو بجوائی کے ساتھ عجب بیکلی ہو رہی تھی۔ بار بار اس کا منہ کھل جاتا اور زبان باہر نکل آتی۔ زبان کو وہ ہونٹوں پہ پھیرتا۔ تالو سے رگڑتا۔ پھر منہ بند کر کے آنکھیں موند کے ساکت ہو جاتا۔ پھر اس کا منہ بند کر کے آنکھیں موند کے ساکت ہو جاتا۔ پھر اس کا منہ کھل جاتا اور وہ جمائی لیتا اور پھر زبان کو گردش دیتا۔ ہونٹوں پہ پھیرتا، تالو سے رگڑتا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ بیکل ہو کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک انگڑائی لی اور دیوار کی طرف چلا۔

"کہاں"، ماجوج نے ٹوکا۔

"یار نیند تو آنہیں رہی۔ میں نے سوچا کہ چلو چل کے دیوار ہی کو چاٹیں۔"

"فائدہ؟"

"فائدہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ہماری ناتوان زبانیں اس اونچی ہیبت بھری دیوار کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔"

"پھر یہ لاحاصل عمل کیوں کیا جائے؟"

"یار مجھے تو اب سب ہی کچھ لاحاصل اور لایعنی نظر آتا ہے۔ مگر بیٹھنے سے بیگار بھلی۔ کم از کم رات تو کٹے گی۔"

یاجوج نے قدم آگے بڑھایا، زبان نکالی اور دیوار کو چاٹنا شروع کر دیا۔ ماجوج بیٹھا تکتا رہا دیوار چاٹتے یاجوج کو تکتے تکتے اس کی زبان میں کھجلی ہونے لگی۔ کیوں نہ میں بھی دیوار کو چاٹنا شروع کر دوں۔ ہے تو یہ مہمل عمل مگر زبان کی کھجلی تو جائے گی۔ اور ماجوج بھی اپنی لمبی زبان کے ساتھ وہاں پہنچا اور دیوار کو چاٹنے لگا۔

رات ڈھلنے لگی تھی۔ کہ یاجوج تھک کر ذرا سانس لینے کے لئے رکا۔ اس نے نظر بھر کر دیوار کو دیکھا اور بہت مطمئن ہوا۔ دیوار چٹ چٹا کر پتلی ورق جتنی رہ گئی تھی۔ اس نے ماجوج کو ٹوکا۔ "دیکھتا ہے یے دیوار کا تو آج ہم نے بھرکس نکال دیا ہے اب اس میں رہ کیا گیا ہے۔"

"ہاں ہم نے دیوار کو بہت چاٹ لیا ہے۔ مگر میں ڈر رہا ہوں۔" "اس سے کہ کہیں پھر صبح نہ ہو جائے۔"

یاجوج تشویش میں پڑ گیا۔ "یار تو ٹھیک کہتا ہے مگر پھر کیا کیا جائے۔"

"ہم سوائے دعا کرنے کے کیا کر سکتے ہیں۔"

پھر یاجوج ماجوج نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ "اے ہمارے رب تیری بخشی ہوئی لمبی دردبھری رات ہمارے لئے بہت ہے صبح کے شر سے ہمیں محفوظ رکھ اور اُجالے کے فتنے کو دفع کر۔"

# دیوار

"وہ تو ہنس رہا ہے۔"

"کیا؟" ایک دم سے سب کی نظریں جبران کے چہرے پہ مرکوز ہو گئیں۔

جبران نے ایک مرتبہ پھر کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ پھر بولا "ہاں بالکل۔ یہ تو ہنسی کی آواز ہے۔ وہ ہنس رہا ہے۔"

سب نے کان لگا کر اس دور کی آواز کو سننے کی کوشش کی اور اپنی ہراساں نظروں اور تشویش بھری خاموشی سے جبران کے بیان کی توثیق کی۔ صرف ایک عماسہ تھا کہ اس تشویش میں حصہ دار نہیں تھا۔ اس کی خاموشی تشویش کی بجائے بے تعلقی کا رنگ لیے ہوئے تھی۔ مندریس نے کہ ان کے بیچ بڑا تھا اپنی تشویش کو اپنے وقار پر غلبہ نہیں پانے دیا۔ ایک وقار کے ساتھ کسی قدر افسردہ لہجہ میں بڑبڑایا "وہ بھی ......" اور چپ ہو گیا۔

دفعتاً عمیر نے جھرجھری لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ رفیقوں نے اسی طرح چپ بیٹھے ہوئے استفسار آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں خبر لے کر آتا ہوں۔" اور وہ چلا گیا۔

وہ سب اسی طرح چپ بیٹھے تھے۔ اب شام کا دھندلکا تھا۔ عمیر کا تعاقب کرتے ہوئے بھی ان کی نظریں زیادہ دور تک اسے نہیں دیکھ سکی تھیں اور اب اس کی راہ تکتے ہوئے بھی زیادہ دور تک نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ مگر بڑھتا ہوا اندھیرا سماعت کی راہ میں حائل نہیں تھا۔ کان اسی طرح دور کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

"اب تو کوئی آواز نہیں آ رہی۔" عساہیل بولا۔

جبران نے تھوڑی دیر کان لگا کر سنا۔ عساہیل کی تائید کرتے ہوئے بولا "ہاں اب کوئی آواز نہیں آ رہی۔ لگتا ہے کہ اس نے ہنسنا بند کر دیا۔"

پھر انہوں نے قدموں کی آہٹ سنی۔ دیکھا کہ عمیر واپس آ رہا ہے۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ کسی نے کچھ نہیں پوچھا۔ سوال ان کے ہونٹوں پر نہیں، آنکھوں میں تھا۔ تکتی ہوئی استفسار آمیز نظروں نے عمیر پر نرغہ کر لیا۔

"وہ تو وہاں ہے ہی نہیں۔"

"کیا؟" ایک مرتبہ پھر سب چونک پڑے۔

"ہاں میرے عزیزو، وہ اب وہاں نہیں ہے۔ میں نے قریب جا کر اس لمبی فصیل پر ایک سمت سے دوسری سمت تک نظر ڈالی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔"

"تو وہ بھی . . . ." منذریس نے اپنے پروقار مگر افسردہ لہجہ میں کہا اور خاموش ہو گیا۔

"مگر کہاں گیا وہ؟" عساہیل نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"جہاں اس سے پہلے جانے والے گئے تھے۔" منذریس نے متانت کے ساتھ جواب دیا اس کی متانت نے جیسے رفیقوں کے لبوں پر مہر لگا دی۔ سب چپ کے چپ رہ گئے۔ دیر بعد عساہیل بڑبڑایا "کتنے ہمارے رفیق اس راہ گئے اور گم ہو گئے۔ عجب بات ہے کہ ہر رفیق ادھر کی خبر لے کر واپس آنے کا اعلان کر کے جاتا ہے۔ مگر دیوار پر چڑھتے ہی اس کی زبان کو تالا لگ جاتا

ہے۔ پھر وہ ہماری طرف نہیں دوسری طرف دیکھتا ہے۔ قہقہہ لگاتا ہے اور دوسری طرف اتر جاتا ہے۔"

"دوسری طرف کیا ہے؟" عساہیل نے سوال اٹھایا۔

"دوسری طرف؟" سب نے حیران ہو کر سوالیہ نظروں سے دیکھا اور سوچ میں پڑ گئے۔ سوائے عماسہ کے۔

مندریس نے عماسہ کو مطمئن دیکھا اور پوچھا "اے عماسہ تو نے کچھ جانا کہ دوسری طرف کیا ہے"۔

"دوسری طرف جاننے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"کچھ نہیں ہے؟ پھر آدمی ادھر کیا دیکھ کر ہنستا ہے؟" عمیر نے برہم ہو کر سوال کیا۔

"یہی دیکھ کر کہ وہاں دیکھنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

عمیر نے اس پر تاؤ کھایا۔ کھڑے ہوتے ہوتے ہوئے بولا۔ "میں دیوار پر چڑھوں گا اور خبر لے کر آؤں گا کہ دیوار کے اس طرف کیا ہے۔"

رفیقوں نے حیران و پریشان نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ دیوار کی طرف جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"تجھ سے پہلے جانیوالے بھی یہی کہہ کر گئے تھے۔" عماسہ نے زہر بھری ہنسی کے ساتھ کہا۔

"مگر میں واپس بھی آؤں گا۔" عمیر نے غصے سے کہا اور تیزی سے روانہ ہو گیا۔

عمیر جلد ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا کہ وہ بہت تیزی سے چلا تھا اور شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ رفیقوں نے حد نظر تک اسے دیکھا اور پھر کان لگا کر بیٹھ گئے ایک خوف بھرے انتظار میں کہ شاید وہی آواز جو وہ کئی بار سن چکے تھے پھر آئے۔

جبران نے یکسوئی کے ساتھ کچھ سننے کی کوشش کی۔ پھر بولا "لو وہ بھی۔"

"کیا؟ وہ بھی؟" رفیقوں نے چونک کر پوچھا۔

جبران نے ایک مرتبہ پھر دور کی آواز پر کان لگائے "ہاں وہ بھی۔"

رفیقوں نے اپنے اپنے طور پر ہنسنے کی اس آواز کو سنا اور خوف بھری آواز میں بولے "وہ یکھی"۔

پھر وہ آواز آتی بند ہو گئی۔ جبران نے بہت کان لگائے مگر کچھ سنائی نہ دیا۔ مایوسی سے بولا "اب کوئی آواز نہیں آ رہی"۔

"مطلب یہ ہے کہ گیا"، مندریس نے کہا۔

"اور کیا مطلب ہو سکتا ہے"۔

دیر تک سب چپ بیٹھے رہے۔ آخر عساہیل نے جھرجھری لی۔ "کاش ہمارے پاس یاجوج ماجوج کی زبانیں ہوتیں"۔

"پھر کیا ہوتا؟" عماسہ نے بیزاری سے کہا۔

"پھر ہم اس دیوار کو رات بھر چاٹ ڈالتے"۔

"مگر صبح کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی"، عماسہ نے اسی بیزاری سے کہا۔

"ہم اسے پھر چاٹ ڈالتے"۔

"اور اگلی صبح کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی"۔

مندریس اپنے بزرگانہ انداز میں بیچ میں پڑتے ہوئے بولا کہ "عزیزو آپس میں تکرار مت کرو۔ سر جوڑ کر یہ سوچو کہ اس دیوار کے مسئلہ کا حل کیا ہو"۔

"بہتر ہے کہ ہم واپس ہو لیں"، جبران بولا۔

عساہیل نے جبران کو گھور کر دیکھا "کیا کہا۔ واپس؟"

"ہاں واپس۔ اب واپسی ہی میں عافیت ہے ورنہ یہ دیوار ہمارے سر بہت خرابی لائے گی"۔

"مگر واپسی ہمیں زیادہ خراب کرے گی"۔

"وہ خرابی اس خرابی سے بہرحال بہتر ہو گی کہ ہم باری باری دعوی اور اعلان کر کے دیوار پہ چڑھیں اور پھر بے معنی ہنسی ہنستے ہوئے بولے بغیر دیوار کے اس طرف اتر جائیں۔ آخر اس عمل سے حاصل؟"

مندریس نے ٹھنڈا سانس بھرا "عزیزو، میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس دیوار نے ہمارے

درمیان دیواریں کھڑی کردی ہیں۔ قبل اس کے کہ ہمارے درمیان دیواریں اونچی ہو جائیں۔ ہمیں اس مسئلہ کا حل تلاش کرلینا چاہیئے۔ سو عزیزو میں نے سوچا ہے کہ اب میں خود دیوار پہ چڑھوں گا۔"

"مندریس تم؟" سب نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں میں۔ میں دیوار پہ چڑھوں گا اور دوسری طرف کی خبر لاؤں گا۔"

"یہ وہی اعلان ہے۔" جبران بولا "جو آگے جانے والے کر کے گئے تھے۔ وہ یہ اعلان کر کے گئے اور واپس نہیں آئے۔"

"مگر میں نے واپسی کی ترکیب سوچ لی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں نے ترکیب یہ سوچی ہے کہ ایک لمبی رسی لے کر اس کا ایک سرا میں اپنی کمر میں باندھوں اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں پکڑاؤں۔ پھر دیوار پہ چڑھوں۔ جب میں ہنسی کا شکار ہو جاؤں اور دیوار کے اس طرف زقند لگانے کے لیے ہمہمی باندھوں تو تم مل کر رسی کو اپنی طرف کھینچو۔ یوں میں زقند لگانے سے باز رہوں گا اور خبر لے کر واپس آؤں گا۔" عماسہ یہ سن کر بے ساختہ ہنسا مگر مندریس نے اس کی ہنسی سے چشم پوشی کی اور اپنے منصوبے پر عمل درآمد کا اہتمام کیا۔ ایک لمبی رسی لے کر اس نے ایک سرا مضبوطی سے اپنی کمر میں لپیٹا اور گرہ لگائی۔ دوسرا سرا رفیقوں کے ہاتھ میں پکڑایا اور چلا دیوار کی طرف۔

دیوار پر چڑھنے سے پہلے مندریس نے جبران اور عساہیل کو دیکھا کہ رسی کا سرا مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ پھر عماسہ کو دیکھا کہ الگ کھڑا تھا۔ "اے عماسہ کیا تو اب بھی الگ تھلگ رہے گا اور مجھے دیوار کے اس پار گر جانے دے گا۔"

عماسہ نے تامل کیا۔ مگر پھر ایک الکساہٹ کے ساتھ آگے بڑھ کر رسی کو تھاما اور بولا کہ "افسوس ہے مجھ پر کہ میں جانتا ہوں کہ یہ عمل کتنا بے معنی اور لاحاصل ہے اور پھر بھی اس میں شامل ہو رہا ہوں۔"

مندریس دیوار پر تیزی سے چڑھا۔ جبران اور عساہیل نے چشم زدن میں دیکھا کہ مندریس

دیوار کی منڈیر پر کھڑا ہے اور اس پار دیکھتا ہے۔ یہ دیکھ کر عساہیل پکارا کہ "اے مندریس کچھ کہہ تو نے دیوار کے اس پار کیا دیکھا؟"

عساہیل کی پکار شام کے سناٹے میں صحرا میں گونجی اور گم ہو گئی۔ عساہیل نے تعجب کیا کہ اس نے مندریس کو پکارا اور مندریس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر جبران نے مندریس کو پکارا اور تعجب کیا کہ مندریس نے اس کی پکار کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

"عجب بات ہے مندریس ہماری پکار کو سن رہا ہے اور چپ ہے۔"

"مندریس اب نہیں بولے گا کہ اس نے دیوار کے اس طرف دیکھ لیا ہے۔" عماسہ بڑبڑایا۔

"مگر" جبران چونکا "مگر وہ ہنس رہا ہے۔"

"کیا" عساہیل نے کان کھڑے کیے "مندریس ہنس رہا ہے۔"

دونوں نے کان لگا کر سنا اور حیران اور خوف زدہ ہوئے۔ مندریس نے بھی جس پہ وہ تکیہ کیے بیٹھے تھے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔

"کیا مندریس بھی؟" جبران نے تشویش سے کہا۔

"نہیں، مندریس کو ہر حال میں واپس آنا ہے کہ وہ رسی سے بندھا ہوا ہے اور رسی کا سرا ہم نے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔"

"مگر عساہیل، میری مٹھی بھاری ہوتی جا رہی ہے۔"

"اے جبران، رسی کو مضبوطی سے تھامے رہ کہ اسی طور ہم مندریس کو دوسری طرف زقند بھرنے سے باز رکھ سکتے ہیں۔"

عساہیل اور جبران نے اور ان کے ساتھ عماسہ نے رسی کو مضبوطی سے تھاما۔ مندریس پہلے آہستہ ہنسا، پھر اس کی ہنسی کی آواز تیز ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ ایک لمبا قہقہہ بن گئی۔ عساہیل، جبران اور عماسہ نے ایک لمبے قہقہہ کو ایک خوف کے ساتھ سنا اور ان کی مٹھی بھاری ہوتی چلی گئی۔

"عزیزو! رسی کو اپنی طرف کھینچو، مبادا ہم خود دیوار پر کھنچے چلے جا بیٹھیں۔" عساہیل بولا۔

رسی کو اپنی طرف انہوں نے پوری طاقت سے کھینچا اور محسوس کیا کہ انہوں نے مندریس کو اپنی طرف گرا لیا ہے۔ پر جب انھوں نے قریب جا کر دیکھا تو حیرت اور خوف سے ان کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ جبران بولا "عزیزو، یہ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ مندریس آدھے دھڑ کی صورت خون میں لت پت پڑا ہے، یہ آدھا دھڑ کہاں گیا۔"

"مجھے لگتا ہے کہ کھینچا تانی میں آدھا دھڑ ہماری طرف آ پڑا۔ آدھا دھڑ دوسری طرف جا پڑا۔"

جبران نے عساہیل کی یہ بات سن کر تامل کیا۔ پھر عماسہ سے مخاطب ہوا "اے عماسہ تو اس باب میں کیا کہتا ہے۔"

عماسہ ہنسا۔ "مندریس نے ایک شوق فضول میں اپنے وجود کو کتنا مضحکہ خیز بنا لیا ہے کہ وہ آدھا ادھر پڑا ہے، آدھا دیوار کے اس طرف۔"

عساہیل نے خون میں لت پت ادھورے مندریس کو دیکھا اور درد کے ساتھ کہا "کاش ہمارے پاس یاجوج ماجوج کی زبانیں ہوتیں۔"

"پھر کیا ہوتا"۔ عماسہ نے جل کر کہا۔

"پھر ہم اس دیوار کو رات رات میں چاٹ ڈالتے۔"

"مگر صبح کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی۔"

"ہم پھر اسے رات رات میں چاٹ ڈالتے۔"

"اور صبح کو وہ پھر کھڑی ہو جاتی۔" عماسہ نے جلے کھنتے لہجہ میں کہا اور زہر میں بجھی ہنسی ہنسا۔ پھر وہ ہنستا چلا گیا۔

جبران اور عساہیل دونوں سکتے میں آ گئے۔

"عماسہ بھی" جبران اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"اور وہ تو دیوار پہ بھی نہیں چڑھا ہے۔" عساہیل نے تعجب سے کہا۔

جبران اور عساہیل دونوں حیرت و دہشت سے عماسہ کو تکے چلے جا رہے تھے جس کی ہنسی اونچی ہوتے ہوتے اب ایک لمبا قہقہہ بن چکی تھی۔

# خواب اور تقدیر

ناقوں پہ سوار چپ سادھے سانس روکے ہم دیر تک اس راہ چلتے رہے حتیٰ کہ آگے آگے چلتے ہوئے ابوطاہر نے اپنے ناقے کی نکیل کھینچی اور اطمینان بھرے لہجہ میں اعلان کیا "ہم نکل آئے ہیں"۔

"نکل آئے ہیں" ہم تینوں نے تعجب اور بے یقینی سے ابوطاہر کو دیکھا "رفیق کیا ہم تیرے کہے پر اعتبار کریں"۔

اور ابوطاہر نے اعتماد سے جواب دیا "قسم ہے اس کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے ہم شہر بے وفا سے نکل آئے ہیں"۔

پھر بھی ہم نے تامل کیا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ارد گرد دیکھا۔ گرد و پیش کا پورا جائزہ لیا۔ کونے کے جانے پہچانے در و دیوار واقعی نظروں سے اوجھل تھے۔ یہ گرد و پیش ہی اور تھا۔ تب ہمیں باور آیا کہ ہم نکل آئے ہیں۔ بس ترت اپنے ناقوں سے اترے اور بے اختیار سجدے میں گر پڑے۔ اور اپنے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کیا۔ پھر راہ کے کنارے کھجوروں کے

سائے میں بیٹھ کر اپنے توشے کو کھولا۔ ایک ایک مٹھی ستو پھانکے اور ٹھنڈا پانی پیا۔ اس ساعت میں ٹھنڈا پانی ہمیں کتنا ٹھنڈا اور میٹھا لگا۔ لگتا تھا کہ ہم پیاسوں نے آج ایک زمانے کے بعد پانی پیا ہے۔ خدا کی قسم اس آفت زدہ شہر میں تو غذائیں اپنا ذائقہ کھو بیٹھی تھیں۔ اور ٹھنڈے میٹھے کنوئیں یکلخت کھاری ہو گئے تھے۔ یا شاید ہم اتنے بے مزہ ہو گئے تھے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی نعمتیں ہمارے لئے بے لذت ہو گئی تھیں۔

یہ سب کچھ اس شخص کے وارد ہونے کے بعد ہوا۔ وہ شخص بالا قد گھوڑے پہ سوار سیاہ عمامہ پہنے منہ پر ڈھاٹا باندھے ڈھال تلوار زیب کمر کئے شہر میں داخل ہوا۔ لوگ سمجھے کہ امام زماں کا ورود ہوا۔ گلی گلی کوچہ کوچہ یہ خبر پھیلی۔ لوگ مسرور ہوئے۔ امام کے تصور سے مسحور ہوئے۔ مرحبا کہتے گھروں سے نکلے اور اس کے گرد اکٹھے ہوئے۔ کس شان سے سواری قصر الامارہ کی سمت چلی۔ لگتا تھا کہ پورا شہر امنڈا ہوا ہے۔

قصر الامارہ کے اونچے دروازے پر پہنچ کر اس نے گھوڑے کی باگ کھینچی اور مجمع کی طرف رخ کیا۔ رخ کرتے کرتے دفعتاً ڈھاٹا کھولا۔ خونخوار صورت کف در دہان۔ نیام سے شمشیر نکالی اور کڑک کر کہا کہ اے لوگو۔ تم میں سے جو جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں آگیا ہوں۔ سب سناٹے میں آگئے وہ بھی جنھوں نے دیکھا اور جانا کہ کون ہے جو آگیا ہے وہ بھی جنھوں نے دیکھا مگر نہ جانا کہ کون ہے جو آگیا ہے۔

اس نے اپنا اعلان کیا اور قصر الامارہ کے اندر چلا گیا۔ لوگ دیر تک ساکت کھڑے رہے۔ آخر کو ابوالمنذر نے مہر سکوت توڑی۔ افسوس بھرے لہجہ میں بولا "کہ شہر کوفہ پر خدا رحمت کرے۔ انتظار اس نے کس کے لیے کھینچا تھا اور وارد کون ہوا؟"

"کون ہے جو وارد ہوا ہے"۔

"اے لوگو۔ تف ہے تم پر کہ ابھی تک تم نے نہیں پہچانا کہ یہ کس باپ کا بیٹا ہے۔ اس باپ کا جس کا باپ نہیں تھا اور جسے لونڈی نے جنا تھا۔

"زیاد کا بیٹا!" بے اختیار کسی کی زبان سے نکلا۔ اور ایک دفعہ پھر سب سناٹے میں آ گئے۔

اس کے آنے کی خبر پھیلتی گئی اور کوچے اور خیاباں خالی اور خاموش ہوتے گئے۔ میں منصور بن نعمان الحدیدی بھرے کوچوں سے گذر کر قصر الامارہ تک پہنچا تھا اور خالی خیابانوں اور حق کرتے کوچوں سے گذر کر واپس گھر پہنچا اور جب اس بے آرام رات کے بعد صبح ہوئے پر میں گھر سے نکلا تو دیکھا کہ شہر بدل چکا ہے۔ خدا کی قسم میں نے اس شہر کو بھٹی پہ چڑھے کڑھاؤ کی مثال ابلتے دیکھا تھا۔ اب میں اسے سینۂ اہل ہوس کی صورت ٹھنڈا دیکھ رہا تھا۔ اور میں دل میں رویا کہ شہر کس شور سے سر اٹھاتے ہیں اور کتنی سرعت سے ڈھے جاتے ہیں۔

میں گرفتہ دل اپنے رفیق دیرینہ مصعب ابن بشیر کے پاس پہنچا۔ گلوگیر ہو کر کہا اے مصعب تو نے دیکھا کہ کوفہ آن کی آن میں کتنا بدل گیا ہے۔

مصعب نے مجھے گھور کے دیکھا اور کہا کہ "اے منصور، تعجب مت کر اور آہستہ بول۔"

میں نے اسے تعجب سے دیکھا، "رفیق کیا تو وہ نہیں ہے جو کل اونچی آواز سے بول رہا تھا۔"

وہ بولا، "کل سب سے اونچی آواز میں ابو المنذر بولا تھا اور آج وہ قصر الامارہ کی دیوار تلے ٹھنڈا پڑا ہے۔"

یہ کہہ کے وہ رفیق مجھ سے شتابی سے رخصت ہوا اور قصر الامارہ کی طرف چلا گیا۔

تب میں نے جانا کہ کوفہ واقعی بدل چکا ہے اور واقعی مجھے آہستہ بولنا چاہیئے۔ بلکہ نہیں بولنا چاہیئے۔ قیس بن مسہر کو میں نے دیکھا کہ وہ بولا اور ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا۔ ابن زیاد کے آدمی اسے پکڑ کر قصر الامارہ کی چھت پر لے گئے۔ کہا کہ بول کیا بولتا ہے۔ اس نے اونچی آواز میں اپنا اعلان کیا کہ اس خاموش شہر میں ہر گھر میں اس کی آواز سنی گئی۔ دوسرے ہی لمحے اسے چھت سے نیچے دھکیل دیا گیا۔ قصر الامارہ کی دیوار تلے کتنی دیر وہ سسکتا رہا۔ دیر بعد اس کا دوست عبد المومن بن عمیر اس راہ سے گذرا اور اپنا خنجر نکال کر اس کے گلے پر پھیر دیا۔ ایک بوڑھے نے سرگوشی میں اس سے

کہا کہ تو نے خوب حق دوستی ادا کیا۔ اور اس نے مسکت جواب دیا کہ میں اپنے عزیز دوست کو سسکتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں یہ نقشہ دیکھ دہاں سے پھرا اور خیاباں خیاباں پریشان پھرتا پھرا۔ لگ رہا تھا کہ میں کوفے میں نہیں ہوں۔ خوف کے صحرا میں ٹھیک رہا ہوں۔

خوف کے صحرا میں بھٹکتے بھٹکتے میری مڈھ بھیڑ ابوطاہر سے ہوئی اور ابوطاہر نے مجھے جعفر ربیعی اور ہارون ابن سہیل سے ملایا۔ کتنے دنوں تک ہم چاروں گونگے بہرے بنے اس خوف کے صحرا میں بھٹکتے پھرے۔ آخر کے تیئں ہم نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ سر جوڑ کر بیٹھے اور سوچا کہ کسی صورت یہاں سے نکل چلیئے۔ اس تجویز پہ جعفر ربیعی رو پڑا۔ بولا "میں کوفے کی مٹی ہوں۔ اس مٹی کو کیسے چھوڑ دوں"۔

ہارون ابن سہیل بولا "ہر چند کہ میں مدینہ کی مٹی ہوں مگر پالنے والے کی قسم اس قریئے سے مفارقت مجھے بھی رلائے گی کہ میں نے اپنی جوانی کے ایام اسی شہر کے کوچوں میں گذارے ہیں۔

تب ابوطاہر نے کہ ہم میں سب سے بڑا تھا میری طرف دیکھا "اے منصور، تو اس باب میں کیا کہتا ہے"۔

میں نے عرض کیا کہ "رفیقو حضور کی یہ حدیث یاد کرو کہ جب تمہارا شہر تم پہ تنگ ہو جائے تو وہاں سے ہجرت کر جاؤ"۔

یہ کلام سن سب رفیق قائل ہو گئے اور نکل چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔

ہم نے شہر سے نکلنا کتنا آسان جانا تھا مگر کتنا مشکل نکلا۔

شہر کے دروازوں پہ پہرہ تھا۔ آتے جاتے والوں پر روک ٹوک تھی۔ کتنی مرتبہ ہم دونوں دروازوں تک گئے اور پہرہ داروں کو چوکنا دیکھ کر چپکے سے واپس چلے آئے۔ کوفہ ہم پر تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ تنگ ہوتے ہوتے چوہے دان کی مثال بن گیا۔ اس کے اندر ہم ایسے ننھے جیسے چوہے دان میں چوہے کہ چکر کاٹیں اور نکلنے کی راہ نہ پائیں۔

نکلنے کی کوئی صورت نہ دیکھ کر ہم جی جان سے بیزار ہوئے ہارون ابن سہیل نے لمبی آہ کھینچی اور کہا کہ "کاش ہماری مائیں بانجھ ہو جاتیں۔ اور ہمارے باپوں کے نطفے ضائع ہو جاتے کہ نہ ہم پیدا ہوتے نہ ہمیں یہ سیاہ دن دیکھنے پڑتے۔"

جعفر ربیعی رویا اور بولا "دائے ہو ہم پر کہ ہم اپنے ہی قریئے میں رنج اسیری کھینچتے ہیں۔ اور دائے ہو اس قریئے پر کہ وہ اپنے بیٹوں کے لیے سوتیلی ماں بن گیا۔"

یاس کی اس انتہا پر پہنچ کر ہم جری بن گئے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ بس کمر ہمت باندھ چل کھڑے ہوئے کہ ہر چہ بادا باد۔ معلوم نہیں یہ کیسے ہوا پہریداروں کی آنکھیں پر پردے پڑ گئے یا نیند آگئی۔ بہر حال ہم اب شہر سے باہر تھے اور آزاد فضا میں سانس لے رہے تھے۔

شام کے سائے بڑھتے جا رہے تھے اور ہوا گرم سے ٹھنڈی ہونے لگی تھی۔

"ہمنفسو رات کالی ہے اور سفر لمبا ہے۔"

"اے اخی، کیا یہ رات کونسے کے دنوں سے زیادہ سیاہ ہے؟"

یہ دلیل سب کو قائل کر گئی۔ ہم اس دمبدم کالی ہوتی رات میں سفر کرنے کے لیے کمریں کس کر تیار ہو گئے۔

"مگر جانا کہاں ہے؟"

اس سوال نے ہمیں چونکایا۔ ہم تو بس نکل کھڑے ہوئے تھے۔ یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے۔

ابو طاہر نے تامل کیا۔ پھر کہا "مدینے، اور کہاں؟"

میں اور جعفر ربیعی اس تجویز کے موئید ہوئے۔ مگر ہارون بن سہیل سوچ میں پڑ گیا۔ دبے لہجہ میں بولا "اگر مدینہ بھی کوفہ بن چکا ہو تو؟"

ہم سب نے اسے بیر ہمی سے دیکھا۔

"اے رفیق"، جعفر ربیعی بولا "تو اس منور شہر کے بارے میں جبکہ تو خود وہاں کی مٹی

ہے ایسا سوچنا ہے"۔

ہارون بن سہیل رکا۔ پھر بولا "ہمنفسو بیشک اس شہر مبارک کی زمین آسمان ہے۔ وہاں کی مٹی معنبر اور ہوا تی مصفا ہے مگر میں اس شہر کی سمت سے آنے والوں سے ملا ہوں۔ میں نے انہیں پریشان پایا"۔

اس پر ہم چپ ہو گئے۔ کسی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ مگر ہارون بن سہیل ابھی چپ نہیں ہوا تھا۔ سوچتے سوچتے بولا "ہمنفسو" میں سوچتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ نورِ حق سے منور ہونے والے شہر کتنی جلدی منقلب ہو گئے۔ کتنی جلدی ان کے دن پراگندہ اور راتیں پریشان ہو گئیں"۔

ابو طاہر نے اسے برہمی سے دیکھا "اے سہیل کے ناخلف بیٹے، تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے۔ کیا تو اسلام کی حقانیت سے انکار کرے گا۔

ہارون بن سہیل بولا "بزرگ، میں پناہ مانگتا ہوں اس دن سے کہ میں خدائے بزرگ و برتر کی وحدانیت میں شک کروں اور اسلام کی حقانیت سے انکار کروں مگر یہ کہ کوفہ۔۔۔"

ابو طاہر نے غصے سے اس کی بات کاٹی "کوفہ کیا؟ کیا کہنا چاہتا ہے تو؟"

"ہاں یہی میں سوچتا ہوں کہ کوفہ کیا اور کیوں؟ بار بار اس خیال کو دفع کرتا ہوں اور بار بار یہ خیال میرا دامنگیر ہوتا ہے کہ مبارک قریوں کے بیچ کوفہ کیسے نمودار ہو گیا۔ اور کتنی جلدی نمودار ہوا۔ ہجرت کو ابھی ایسا کونسا زمانہ گذر گیا ہے"۔

میں نے دیکھا کہ ابو طاہر کے مزاج کی درہمی بڑھتی جا رہی ہے۔ میں نے بات بیچ میں کاٹی اور کہا کہ "رفیقو میری تجویز یہ ہے کہ اس شہر چلیں جسے حق تعالیٰ نے شہر امن قرار دیا ہے۔ بیشک دنیا ظالموں سے بھر جائے اور زمین فساد سے تہہ و بالا ہو جائے مگر مکہ کے مبارک شہر کے امن میں خلل نہیں آئے گا"۔

سب رفیقوں نے میری اس تجویز پر صاد کیا اور ہم فوراً ہی ناقوں پر سوار ہو گئے۔

تاریکی بہت تھی کہ یہ چاند کے شروع کی راتوں میں سے ایک رات تھی۔ مگر ہمارا جذبہ ہمیں کھینچے لیے جا رہا تھا۔ اب رات بھیگ چکی تھی اور آسمان سے اترتی خنکی نے ہمارے دلوں میں ترنگ پیدا کر دی تھی۔ شہر امن کے تصور میں مگن اور رہائی کے نشہ سے سرشار ہم بڑھے چلے جا رہے تھے۔ ناقہ پر بیٹھے بیٹھے مجھے اونگھ آ گئی میں نے کیا حسین خواب دیکھا کہ میں شہر امن میں نیک پاک بزرگوں کے بیچ بیٹھا ہوں اور کوفہ کا احوال سنتا ہوں۔ اچانک کان میں ایک آواز آئی "یہ تو ہم پھر وہیں آ گئے"۔ اور میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ اب تڑکے کا وقت تھا اور سامنے کوفے کے در و دیوار نظر آ رہے تھے۔

"یہ تو ہم پھر وہیں آ گئے"۔ جعفر ربیعی کہہ رہا تھا۔

ابو طاہر نے، ہارون بن سہیل نے حیرت و دہشت سے بھری نظروں سے ان در و دیوار کو دیکھا۔

"مگر کیسے؟" میرے منہ سے نکلا۔

ابو طاہر نے تامل کیا، پھر کہا "رات بہت کالی تھی۔ ہم نے راہ پر دھیان نہیں دیا جس رستے آئے تھے اسی رستے چل پڑے"۔

ہم سب چپ تھے۔

"اب کیا کریں"۔ جعفر ربیعی نے سوال کیا۔

ابو طاہر نے تامل کیا اور کہا "رفیقو واپسی اب محال ہے کہ پہرے والوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ شاید قدرت کو ہمارا یہاں سے نکلنا منظور نہیں"۔

ہارون بن سہیل نے ٹھنڈا سانس بھرا "درست کہا۔ کوفہ ہماری تقدیر ہے"۔

اور میں منصور بن نعمان الحدیدی افسردہ ہو کر بولا کہ "ہاں مکہ ہمارا خواب ہے۔ تقدیر ہماری کوفہ ہے"۔

اور ہم تھک ہار کر واپس کوفے میں آ گئے۔



# صبح کے خوش نصیب

ہم لوگ بیچ جنگل میں تھے اور گاڑی رکی کھڑی تھی۔ کتنی مرتبہ گمان ہوا کہ گاڑی اب چلی مگر نہیں چلی۔ کتنی مرتبہ گاڑی سے باہر بکھرے ہوئے مسافر سیٹی دیتے انجن سے اشارہ لیکر لپک جھپک واپس اپنی اپنی نشست پہ آئے اور دم سادہ کر بیٹھ گئے کہ اب گاڑی چلے گی۔ دم سادھے بیٹھے رہے اور انتظار کرتے رہے کہ کب گاڑی حرکت میں آتی ہے۔ گاڑی حرکت میں یا تو آئی ہی نہیں۔ آئی تو بس اس قدر کہ پہیئے مشکل سے تھوڑا گھومے اور ڈبوں کو تھوڑا جھٹکا لگا مگر پہیے پورا چکر لینے سے پہلے ہی رک گئے اور گاڑی ایک تھرتھری کے بعد پھر ساکت ہوگئی مسافر بیٹھے رہے، بیٹھے رہے۔ پھر کسی نے بے اطمینان ہو کر پہلو بدلا۔ کوئی بیزار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ایک کر کے پھر گاڑی سے اترنے اور پٹڑی پہ چہل قدمی کرنے لگے۔ کسی نے پٹڑی کو پار کیا اور درختوں کے سائے میں جا بیٹھا۔

"امی گاڑی کیوں نہیں چلتی؟" بچے نے بور ہو کر ماں سے سوال کیا۔

"چلے گی۔"

"کب چلے گی؟"

"بس ابھی چلے گی"

مگر وہ کمسن ماں سے یہ جواب پہلے بھی سن چکا تھا۔ بیدلی سے اس نے سنا اور باہر جھانکنے لگا۔

سامنے کی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت نے گود کے بچے کو پہلے خالی باتوں سے بہلانے کی کوشش کی۔ جب وہ نہ مانا اور سینے پہ دست درازی کرنے لگا تو اس نے قمیص کا دامن اٹھا کر بچہ کا منہ اندر کیا اور دامن گرا لیا۔ قمیص کا دامن اس نے اتنی چابکدستی سے اٹھایا کہ پیٹ کے ایک بے معنی سے گوشے کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ خیر اس سے اتنا پتہ تو چل ہی گیا کہ اس میلے لباس کے اندر کتنا روشن بدن چھپا ہوا ہے۔

میرے برابر کی نشست پر بیٹھے ہوئے بڑے میاں جو بڑی یکسوئی سے اخبار پڑھے چلے جا رہے تھے۔ بالآخر اخبار پڑھتے پڑھتے تھک گئے۔ اخبار کو ایک طرف رکھا اور بڑبڑائے

"بہت دیر ہو گئی۔ آخر گاڑی کیوں نہیں چل رہی ہے؟"

"کوئی کراسنگ ہونا ہے"۔ قریب میں بیٹھا ہوا بریف کیس والا آدمی بولا

"میرے خیال میں تیز گام آرہی ہے۔" دوسرے نے ٹکڑا لگایا۔

"تیز گام؟" بریف کیس والے نے کلائی پہ لگی خوبصورت گھڑی کو دیکھا "تیز گام کا تو یہ وقت نہیں ہے۔

"پھر اور کوئی گاڑی ہو گی"۔

"ہاں اور کوئی گاڑی ہو گی۔ مگر بڑی دیر لگائی"۔

"اصل میں پسنجر کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ چیونٹی کی چال چلتی ہے اور قدم قدم پہ رکتی ہے"۔

پسنجر ٹرین کی خرابیاں اب ان پہ کھل رہی تھیں سوار ہوتے وقت تو وہ انہیں کشتی نوح نظر آرہی تھی۔ پلیٹ فارم پر کتنا ہجوم تھا کتنی دھکم پیل کے ساتھ وہ گاڑی میں گھس

رہے تھے اور سیٹ لینے کے لیے ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے، ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ جو اندر داخل ہو گئے تھے ان کی سر توڑ کوشش تھی کہ اب کوئی اندر نہ آئے۔ جو باہر رہ گئے تھے وہ سر توڑ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اندر داخل ہو جائیں۔ اندر داخل ہو جانے والوں نے کتنی پھرتی سے اپنے ڈبے کے دروازے بند کئے تھے۔ اور بعد میں آنے والوں نے کتنے زور کے ساتھ دروازے کھلوائے تھے اور سامنے آنے والوں کو دھکے دیتے ہوئے، بستروں اور بکسوں کو پھلانگتے ہوئے نشست کی تلاش میں بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ کتنی دھینگا مشتی کے بعد کبھی بیٹھنے کی اور کبھی محض کھڑا ہونے کی جگہ میسر آئی۔ پھر جب گاڑی چلی تو ہم سوار ہو جانے والوں نے اپنے آپ کو کتنا خوش نصیب اور پیچھے رہ جانے والوں کو کتنا بد نصیب جانا تھا۔ پھر یکایک پیچھے رہ جانے والوں کے لئے ہمارے یہاں کتنی ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ چلتی ہوئی گاڑی کے ساتھ دوڑتے دوڑتے اگر کوئی ہنڈل پکڑ کے لٹک گیا تو کسی نہ کسی نے جلدی سے اس کے لئے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کی راہ دیدی۔ پھر چلتی ہوئی گاڑی سے ہم نے اک گونہ اطمینان کے ساتھ اپنی اپنی کھڑکی سے باہر جھانک کے دیکھا۔ پلیٹ فارم پر کھڑے رہ جانے والے مسافر کتنے بے آسرا اور کتنے قابل رحم نظر آ رہے تھے۔

اب پہیہ الٹا گھومنے لگا تھا۔ اس گاڑی کے مسافر ہونے کی بنا پر ہم اپنے آپ کو کتنا بے آسرا کتنا قابل رحم سمجھ رہے تھے۔ اور وہ جو گاڑی میں سوار نہ ہو سکے؟ اچھے رہے وہ لوگ جو اس گاڑی میں سوار ہوتے ہوتے رہ گئے۔

"میری سیٹ تو جہاز میں بک تھی،" بریف کیس والا بولا "لیکن پروگرام میں تبدیلی کی وجہ سے مجھے اپنی سیٹ کینسل کرانی پڑی۔ اس کے بعد کسی فلائٹ میں کوئی سیٹ نہیں ملی۔ سوچا کہ ٹرین پکڑی جائے۔ تیزگام، سپیریر کسی میں سیٹ نہیں ملی۔ آخر کو پسنجر میں بیٹھنا پڑا۔"

ایک دفعہ پھر مسافر تیزی کے ساتھ اندر آئے اور اپنی اپنی نشست پر آکر بیٹھ گئے۔

اصل میں ابھی ابھی انجن نے سیٹی دی تھی۔

"گاڑی اب چلنے لگی ہے" کہنے والے کے لہجہ میں دبی دبی خوشی کا رنگ شامل تھا۔

"واقعی؟"

"ہاں بس چلنے والی ہے۔ انجن نے سیٹی دیدی ہے۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔"

کمسن لڑکے نے جھانک کر باہر دیکھا "امی دیکھو۔"

"دیکھوں، کیا بات ہے۔"

"دھواں" اس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

امی نے باہر جھانک کر دیکھا۔ میں نے بھی باہر جھانکا۔ واقعی انجن نے اچانک کتنے زور شور سے دھواں اگلنا شروع کر دیا تھا۔ سیٹی ہی سے نہیں اس دھوئیں سے بھی شاید مسافروں نے یہ اشارہ لیا تھا کہ بس اب گاڑی چل پڑے گی۔ انجن کے منہ سے ایسا کالا دھواں نکل رہا تھا کہ لگتا تھا کہ کوئی دیر جاتی ہے کہ سارا جنگل کالا ہو جائے گا۔ چلتی گاڑی کا انجن جب دھواں اگلتا ہے تو اس کی بات اور ہوتی ہے فضا میں کالونس کی ایک لکیر کھینچتی اور مٹتی چلی جاتی ہے مگر جب کھڑا ہوا انجن دھواں اگلتا ہے تو فضا کی پاکیزگی کے لیے خطرہ بن جاتا ہے

انجن نے دھواں اگلتے اگلتے ایک دفعہ پھر سیٹی دی اتنی تیز کہ پورے جنگل میں گونج گئی۔ جنگل میں بھی اور ہم مسافروں کے دلوں میں دل جیسے سیٹی کی آواز سے گرما گئے بدن وہ جو ایک بیزاری چھائی ہوئی تھی وہ کافور ہو گئی۔ ہم سب ہی مستعد اپنی نشست پہ بیٹھ گئے۔ لگ رہا تھا کہ گاڑی بس حرکت میں آنے والی ہے۔

بیٹھے رہے، بیٹھے رہے۔ پہیوں نے بالکل پہلے کی طرح ایک ہلکی سی جنبش کی تھی۔ اور اس سے ایک تکلیف بھری آواز بھی پیدا ہوئی تھی جیسے پہیوں کو گردش کرنے میں تکلیف

ہو رہی ہو۔ مگر پھر وہی سکتہ۔ اور اب تو دھوئیں کا زور بھی کم ہوتا جا رہا تھا۔ کالے سے بھورا ہوا اور پھر بالکل ہی معدوم ہو گیا۔

جب گاڑی کسی طور حرکت میں نہ آئی تو پھر وہی بیزاری۔ بڑے میاں نے بور ہو کر پھر اخبار اٹھایا اور پڑھی ہوئی خبروں کو پڑھنا شروع کر دیا۔ سامنے بیزار گود میں بچہ پھر کلبلایا اور اس نے اس مرتبہ اتنی بیزاری اور لاپرواہی سے قمیض اوپر اٹھائی کہ دم بھر کے لیے تو پیٹ سے اوپر کا ہرا بھرا منطقہ بھی نمایاں ہو گیا۔

"گاڑی آج نہیں چلے گی"۔ کسی نے بیزار ہو کر کہا۔

"امی گاڑی نہیں چلے گی"، کمسن لڑکے نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"چلے گی بیٹے"۔

"کب چلے گی؟"

"بس تھوڑی دیر میں چلے گی۔"

کمسن لڑکے نے بے اعتباری سے ماں کا جواب سنا اور پھر باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

"شام ہو رہی ہے"۔ ایک مسافر نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

ہاں واقعی۔ وہ وسیع دو رنگ میدان اور کھیت جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تک دھوپ میں چمک رہے تھے اب چھاؤں میں آ چکے تھے۔ اور چھاؤں پھیلنے کے ساتھ ساتھ جیسے اداسی پھیلتی جا رہی ہو۔

"رات کہیں اسی جنگل میں نہ گذارنی پڑ جائے"۔

"اس جنگل کا راستہ تو دن میں بھی محفوظ نہیں۔ رات گذارنی پڑی تو......"

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ مگر اس کے تشویش بھرے لہجہ نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

بڑے میاں نے اخبار سے نظریں اٹھا کر کہنے والے کی صورت دیکھی۔ پھر اخبار ایک طرف ڈال کر منہ ہی منہ میں کوئی آیت پڑھی۔ لا الہ انت سبحانک...... چپ

ہوئے۔ پھر انہوں نے بولنے والوں کی طرف سے منہ پھیر کر مجھے اپنے خطاب کے لئے چُنا۔

"بیٹے تم کہاں جا رہے ہو؟"

"یہ سوال بے محل ہے"

انہوں نے غور سے میری صورت دیکھی "بے محل کیسے ہے"۔

"ہم یہیں سے کسے کہاں جانا ہے۔ یہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم یہاں سے کب نکل رہے ہیں"۔

"اور نکل بھی رہے ہیں یا نہیں"، کسی قریب بیٹھے ہوئے نے ٹکڑا لگایا۔

اسی گھڑی گارڈ اپنی سفید وردی میں گذرتا نظر آیا۔ ایک مسافر اسے دیکھ کر پھرتی سے اٹھا اور گاڑی سے اتر گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ گیا۔ سب نے اسے متجسس نظروں سے دیکھا۔

"یہ گارڈ تھا؟"

"ہاں"

"کیا کہتا ہے، گاڑی کیوں نہیں چل رہی؟"

"آگے گڑبڑ ہے"۔

"میرا خیال ہے"، بریف کیس والا بولا "آگے کوئی حادثہ ہوا ہے۔ نہیں تو گاڑی اتنی دیر نہیں رک سکتی تھی"۔

"ہوا تو نہیں ہے۔ ہو جاتا"۔

"اچھا؟"

"ہاں۔ اور اسی گاڑی کے ساتھ ہو جاتا۔ وہ تو بر وقت پتہ چل گیا"۔

"اچھا؟ کیا بات تھی؟"

"آگے پٹڑی اکھڑی ہوئی ہے"۔

"پھر تو بچ گئے"۔

"ہاں یہاں سے نکل جائیں پھر جانیں"۔

ہاں واقعی میں نے سوچا پہلے یہاں سے تو نکلیں۔ اور اسی کے ساتھ مجھے پھر اس گھڑی کا خیال آیا جب ہم اس گاڑی میں سوار ہوئے تھے۔ ہم گاڑی میں بیٹھے لوگ کس طرح ایک احساس تحفظ کے ساتھ ان پر ترس کھا رہے تھے جو پیچھے رہ گئے تھے۔ اب وہ ہم پر ترس کھائیں گے۔ خوش نصیبی اور بد نصیبی کا کتنی جلدی آپس میں تبادلہ ہو گیا۔ صبح کے خوش نصیب شام ہوتے ہوتے بد نصیب بن چکے ہیں۔ اچھے رہے وہ لوگ جو گاڑی میں سوار نہ ہو سکے اور ایک وقتی بد قسمتی سے گزر کر خوش قسمت بن گئے۔ اور ہم ..... ہاں اور ہم۔ میں نے ارد گرد نظر ڈالی۔ شام کی چھاؤں باہر سے رینگ کر اندر آ گئی تھی۔ ساتھ ہی اداسی بھی جو شام کی چھاؤں کی ہمزاد ہے۔ ڈبے میں ابھی لائٹیں نہیں جلی تھیں۔ اپنی اپنی نشست پہ چپ چاپ بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے سب آدمی سائے دکھائی پڑ رہے تھے۔

# شور

"کیا خیال ہے۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"اس کے بعد کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"مثلاً"

"مثلاً" وہ سوچ میں پڑ گیا "یار CONFUSION بہت ہے۔" پھر وہ چپ ہو گیا اور چائے پینے لگا۔

میں بھی چپ رہا اور چائے پیتا رہا۔ پھر باہر سے کسی کے چلاتے کی آواز آئی۔ میں نے کان کھڑے کئے۔ غور سے سنا اور اٹھ کھڑا ہوا "ضمیمہ آگیا۔" باہر جا کر ضمیمہ خریدا۔ واپس آ کر ضمیمہ کھولا اور ہم دونوں نے اکٹھے اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

پڑھ چکنے کے بعد "اب کیا خیال ہے تمہارا۔"

"یار اتنی ہی خبر ہے۔ کوئی نئی تفصیل تو ہے نہیں۔"

"پھر بھی کیا خیال ہے تمہارا۔ اب کیا ہوگا؟"

"اب کیا ہوگا۔" سوچ میں پڑ گیا "یار۔ ٹیڑھا سوال ہے"

"پھر بھی"

سوچتے ہوئے بولا "میرا خیال یہ ہے۔۔۔" مگر ارد گرد دیکھ کر پھر چپ ہوگیا "یار یہاں شور بہت ہے"

میں نے آس پاس کی میزوں پر نظر ڈالی۔ آس پاس کی سب میزیں بھری ہوئی تھیں۔ چائے پینے والے چائے کم پی رہے تھے۔ باتیں زیادہ کر رہے تھے۔ ہماری میز کے بالکل برابر کی میز سب سے زیادہ پرشور تھی۔ پیالیاں کم نفری زیادہ۔ اتنی اونچی آواز میں بول رہے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے آس پاس کی کسی میز پر اطمینان سے بات نہیں ہوسکتی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں تعجب کیا۔ تھوڑا غصہ بھی آیا۔ کیا بے فکرے لوگ ہیں۔ ایسے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

دور کی میزوں کا جائزہ لیا۔ کچن کے برابر کے گوشے میں کئی میزیں خالی نظر آئیں۔

"چلو ادھر چلتے ہیں"

ہم دونوں اٹھ کر کچن کے برابر والے گوشے میں جا بیٹھے۔ یہ گوشہ واقعی پرامن تھا۔ بات اطمینان سے ہوسکتی تھی۔ چائے کا نیا آرڈر دیا۔ پھر اس کی طرف دیکھا "یہاں بات ہوسکتی ہے"۔

"ہاں یہاں بات اطمینان سے ہوسکتی ہے"۔ اس نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا خیال ہے تمہارا۔ اب کیا ہوگا"

اسی گھڑی دو شخص داخل ہوئے اور ہمارے پاس کی میز پر آکر بیٹھ گئے۔ ایک کی نظر ہماری میز پر رکھے ضمیمہ پر پڑی "اچھا ضمیمہ شائع ہوگیا ہے"۔ اٹھ کر قریب آیا۔ "ذرا دیکھ سکتا ہوں"

"ضرور" یہ کہتے کہتے میں نے وہ یک ورقی اخبار اٹھا کر اس کے حوالے کر دیا۔

ضمیمہ لیکر وہ اپنی میز پر جا بیٹھا اور سامنے پھیلا کر پڑھنے لگا۔ تھوڑے فاصلہ کی میز پر بیٹھے

ہوئے ایک شخص نے ضمیمہ کو تاڑا "اچھا ضمیمہ آ گیا"۔ یہ کہتے ہوئے اٹھا اور قریب آ کر اس پہلے ورق پر جھک گیا۔ اس نے یہ بات کسی قدر اونچی آواز میں کہی تھی۔ آس پاس کی کئی میزوں پر جہاں یہ بات سنی گئی کان کھڑے ہو گئے۔ کئی ایک اٹھ کر آئے اور اس میز کے گرد کھڑے ہو گئے۔

"کیا کہتا ہے ضمیمہ"

استفسارات، تبصرے۔ کوئی تائیدی آواز۔ کوئی اختلافی نوٹ، کوئی تاسف۔ پھر اکہرا بحث، لہجہ تندو تیز ہوتا گیا۔ آوازیں اونچی ہوتی چلی گئیں۔

ہم دونوں چپ ادھر دیکھتے رہے۔ پھر بے چینی سے بولا "یار بہت شور ہے یہاں بیٹھ کے تو بات کرنا بہت مشکل ہے"۔

"تو پھر نکلیں یہاں سے"۔

وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ سوچا کہ کیفے ڈی پیلیس میں فضا پر سکون ہو گی۔ مگر وہاں قدم رکھا تو لگا کہ شور کے سمندر میں اتر گئے ہیں۔ پھر مختلف چائے خانوں میں جھانکا۔ ہر جگہ رش ہر جگہ شور۔

"یار بہت شور ہے"

"سمجھ میں نہیں آیا کہ آج اتنا شور کیوں ہے"۔ میں نے کہا۔

"اور رش دیکھو۔ لگتا ہے کہ شہر سارا چائے پینے اور گپیں مارنے کے لیے نکلا ہوا ہے۔ لوگ کتنے بینگرے ہیں"۔

"اتنا شور، اتنا رش۔ اس شہر میں تو ہمارے لئے سانس لینا مشکل ہو جائے گا"۔ میں نے اس کی تائید میں کہا۔

"یار یہ شہر کتنا خاموش ہوا کرتا تھا۔ ہم کتنے اطمینان سے اس سڑک پہ چلا کرتے تھے"۔

میں نے سڑک پر دور تک نظر دوڑائی۔ بسیں، موٹریں، ٹیکسیاں، رکشائیں اور سب سے بڑھ کر سکوٹر۔ ایک طوفان اٹھا ہوا تھا۔ شور الٰہی توبہ۔ بس اس ساعت میں جب ہم ایک خاموش گوشے کی تلاش میں تھے۔ اچانک ہمیں احساس ہوا کہ شہر میں کتنا ہجوم ہو گیا ہے اور شور کتنا بڑھ

گیا ہے۔

اب شاید اس کے یہاں بھی بات کرنے کی خواہش زور پکڑ گئی تھی خاموش گوشے کی تلاش میں جتنا میں سرگرم تھا اتنا ہی وہ سرگرم تھا۔ کہاں کہاں پہنچے اور کہاں کہاں سے مایوس پھرے۔ اور بات کرنے کی خواہش تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ جیسے ہمیں بہت اہم مسائل پہ گفتگو کرنی ہے

"ریستوراں سب بھرے ہوئے ہیں۔ آؤ چلو کمپنی باغ چلتے ہیں۔"

ہم اس پر شور شاہراہ سے گزر کر ایک خاموش رستے پہ پڑ لئے۔ چار قدم چل کر کمپنی باغ پہنچ گئے۔ کمپنی باغ کی فضا میں کتنا سکون کتنی آسودگی تھی۔ یہاں تہاں اکا دکا آدمی۔ کوئی کسی روش پہ چہل قدمی کرتا ہوا، کوئی خاموش کسی بنچ پہ بیٹھا ہوا۔ ہم بھی ایک پتھر کی بنچ پہ بیٹھ گئے۔ شور کا سمندر پار کر کے آئے تھے۔ سستا رہے تھے۔ قریب سے ایک جوڑا گزرا۔ تھوڑا آگے چل کر نوجوان نے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔

دونوں درختوں کے سائے میں چلتے چلتے ایک گھنے پیڑ کی اوٹ میں گئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"تفصیلات کا پتہ نہیں چل رہا۔ بہت کنفیوژن ہے" وہ بڑبڑایا۔

بانی رے پانی تیرا رنگ کیسا۔ دور سے آواز آئی۔

آواز قریب آتی گئی۔ یک نوجوان ٹرانسسٹر ہاتھ میں لٹکائے چلا آرہا تھا۔ قریب ہی گھاس کے تختے پر بیٹھ۔ ٹرانسسٹر یک طرف رکھ جوتے کے تسمے کھولنے لگا۔ گانے نے ہم دونوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ کان لگا کر سنتے رہے سنتے رہے۔

"یہ لتا تھی؟"

"ہاں اور ساتھ میں کشور کمار۔" میں نے کہا۔

مگر اس کے بعد ٹرانسسٹر کی آواز اونچی ہوتی چلی گئی۔ لتا کا ایک گانا، دوسرا گانا، تیسرا گانا، پھر مٹر گشت کرتے چند نوجوان آئے۔ قریب ہی گھاس کے ایک تختے پہ انہوں نے بھی ڈیرا ڈال

دیا۔ ان کے پاس ٹیپ ریکارڈر تھا۔ انہوں نے اپنی پسند کے گانے سننے شروع کر دیئے تھے۔

"یار یہ تو بہت بور ریت ہے"۔

"اور ان کی پسند کتنی بیہودہ ہے۔ (VULGER) مجھے اس ٹولی پر سخت غصہ آرہا تھا"۔

"ہمیں آج اس شہر میں کہیں پناہ نہیں ملے گی"۔

"پتہ نہیں لوگ گانا اتنی اونچی آواز میں کیوں سنتے ہیں"۔

"دھیمے سُر غیر موثر ہو چکے ہیں۔ شور اتنا ہے کہ کسی کو کسی کی بات سنائی نہیں دیتی ایسے میں آدمی کیا بات کرے"۔

ہم دونوں چپ ہو گئے۔ ایک طرف سے ٹرانسسٹر، دوسری طرف سے ٹیپ ریکارڈر۔ دایئں شور۔ بایئں شور۔ ہم بیزار ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مختلف روشوں پر چہل قدمی کی۔ شام ہو چکی تھی۔ باغ میں سیلانیوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم باغ سے باہر نکل آئے۔

"تم نے بی بی سی سنا تھا؟" چلتے چلتے اس نے پوچھا

"نہیں"۔

"بی بی سی سننا چاہیئے"۔ یہ کہتے کہتے وہ شروع ہو گیا۔ آخر دماغ میں تو وہی بات اٹکی ہوئی تھی۔ بلکہ کانٹا کھٹک رہا تھا۔ جب تک کانٹا نہ نکل جاتا ہم دونوں میں سے کسی کو چین نہیں آسکتا تھا۔ کانٹا اب نکلنے لگا تھا۔ مگر اسی دم پھر پیچھے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ وہ چپ ہو گیا۔ پیچھے چلنے والا تیز قدم چل رہا تھا۔ ہم نے اپنی رفتار سست کر دی۔ جلد ہی وہ آگے نکل گیا۔ اب اطمینان سے بات ہو سکتی تھی۔ مگر یہ سڑک ایسی تھی کہ شام پڑے لوگ یہاں چہل قدمی کرتے ادھر آنتے تھے۔ اور جو صاحب ہمارے پیچھے آرہے تھے وہ اتنے اطمینان سے چل رہے تھے کہ ہماری رفتار میں سستی آجانے کے باوجود ہمارے اور اس کے درمیان فاصلہ پیدا نہیں ہو سکا۔

"چلو پھر گھر چلتے ہیں"، میں نے تجویز پیش کی۔

"تم تو اکیلے ہی رہتے ہو۔"

"اور کیا۔"

"پھر چلتے ہیں۔" "وہاں اطمینان سے بات کریں گے۔"

پلٹ لئے۔ گھر جاکر اپنا کرہ کھولا۔ بیٹھو۔"

بیٹھتے ہوئے اس نے ایک نظر ادھر ادھر ڈالی "یار تمہارے پاس ریڈیو نہیں ہے۔"

"ریڈیو نہ ٹرانسسٹر۔"

"ہوتا تو اس وقت بی بی سی سنتے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ بی بی سی کچھ بتائے گا۔"

"بالکل بتائے گا۔ ویسے آج اپنا ریڈیو بھی سننا چاہیئے۔ مگر تم نے تو یہ کھڑاک رکھا ہی نہیں ہے۔ نہ ریڈیو نہ ٹی وی۔"

"ایسے کھڑاک بیویاں اکٹھا کیا کرتی ہیں۔" میں نے کہا

"اور بیوی بجائے خود ایک کھڑاک ہے۔"

"اسی لئے تو پالا نہیں۔"

"اچھا کیا۔ سکون سے ہو۔" رک کر بولا "مجھے لگتا ہے کہ تمہارے ہمسائے بھی سب چھڑے ہیں"

"کیسے جانا۔"

"یار یہاں خاموشی بہت ہے۔"

"یہ محلہ نہیں ہے۔ فلیٹ ہیں۔ فلیٹ میں رہنے والوں کا پتہ نہیں چلتا ورنہ میرے دائیں بائیں جتنے فلیٹ ہیں ان میں پورے پورے خاندان آباد ہیں۔"

میں نے سوچا کہ پہلے کچھ چائے کا اہتمام کر لینا چاہیئے۔ چائے سامنے رکھی ہو تو بات اطمینان سے ہوتی ہے۔ دودھ دیکھا موجود تھا۔ چائے کی پتی اور چینی تو رہتی ہی ہے۔ کیتلی میں پانی بھرا اور ہیٹر پہ رکھ دیا۔

"یار تمہارے پڑوس میں کوئی بچہ بھی نہیں ہے؟"

"ارے یار بہت ہیں۔"

"آواز تو کوئی آ نہیں رہی۔ کسی قسم کی کوئی آواز ہی نہیں ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ یہ فلیٹ ہیں۔ تم محلے کے حساب سے مت دیکھو"

میرے جواب نے اسے مطمئن نہیں کیا۔ تھوڑا چپ رہ کر بولا "یار بہت سناٹا ہے۔ لگتا ہے کہ جنگل میں آ گئے ہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا دھیان سنسناتے پانی کی طرف تھا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"چائے بنا رہا ہوں۔ ابھی تیار ہوتی ہے۔ پھر اطمینان سے باتیں کریں گے۔"

"چھوڑ یار۔ وہیں اپنے ٹھکانے پہ چل کے چائے پیتے ہیں۔" وہ ایک دم سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہاں سے تو مجھے وحشت ہونے لگی۔"

میں نے اسے حیرت سے دیکھا "یہاں اطمینان سے بات ہو سکتی تھی۔"

"ٹھیک ہے مگر" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "یہاں بیٹھ گئے تو خبروں کا وقت نکل جائے گا۔ اپنے ٹھکانے پر چلتے ہیں۔ وہاں ریڈیو ہے۔ خبریں بھی سنی جا سکیں گی۔" رکا بولا "یہاں تو لگتا ہے کہ دنیا سے کٹے بیٹھے ہیں۔"

واقعی۔ اس کمرے میں بند ہو کر تو دنیا سے میرا رشتہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ باہر دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اصل میں اس کمرے میں کوئی ایسا دریچہ نہیں جہاں سے آسمان نظر آتا ہو۔ آسمان نظر نہ آئے تو یہی لگتا ہے کہ دن سے ہمارا رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔

باہر نکل کھڑے ہوئے۔ سڑک خالی خالی تھی۔

"کیا بج گیا؟" اس نے تھوڑا چونک کر کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی "کمال ہے آج اتنی جلدی سناٹا ہو گیا۔"

واقعی سناٹا تھا۔ کوئی کوئی رکشا گذرتی تو تھوڑا شور ہوتا مگر اس کے گذر جانے کے بعد خاموشی اور گہری ہو جاتی۔ ہمیں اپنے قدموں کی چاپ اونچی سنائی دے رہی تھی۔ ہم آہستہ چلنے لگے۔

اپنے ٹھکانے پر پہنچے۔ آج یہ ریستوراں اتنی جلدی خالی ہو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم اسے بھرا چھوڑ کر گئے تھے۔ اس وقت شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھے۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی رخصت ہو گئے۔ اب صرف ہم رہ گئے۔ چائے کا آرڈر دیا۔

"آج ابھی سے یہاں الو بولنے لگا۔" وہ بولا

"اچھا ہی ہے۔ ہجوم میں بات نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں اچھا ہی ہے۔" پھر سوچ کر بولا "یار کنفیوژن بہت ہے۔

" پہلے نہیں تھا؟"

"ٹھیک کہتے ہو۔ کنفیوژن پہلے بھی تھا۔" پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ آخر زبان کھولی "اس کے پیچھے کیا ہے، یہ تو ابھی پوری طرح واضح نہیں۔ مگر میرا خیال ہے"۔ وہ چل پڑا تھا کہ اتنے میں چائے آگئی۔ چپ ہو گیا اور چائے بنانی شروع کر دی۔ چائے بناتے بناتے بولا "یار وہ لڑکی اچھی تھی۔"

"لڑکی، کونسی لڑکی؟"

"وہی لڑکی جو کمپنی باغ میں نظر آئی تھی"۔

"اچھا وہ" اور وہ لڑکی اپنی بھری بھری گات اور شاداب بہائے کے ساتھ تصور میں بھر گئی "ہاں اچھی تھی۔"

جیسے ہوا رکی ہوئی ہو اور اچانک ایک ٹھنڈا جھونکا آجائے۔ مجھے تو ایسا ہی لگا۔ وہ بھی ہنشاش نظر آرہا تھا۔ پھر ہم نے اس خوشگوار جسم کی جملہ تفصیلات پر غور کیا اور طے کیا کہ لڑکی واقعی اچھی تھی۔

"یار" وہ سوچتے ہوئے بولا "لڑکی تو ہماری زندگی سے نکل ہی گئی"۔

میں ہنس پڑا "آئی کب تھی"۔

"پھر بھی" سنجیدگی سے بولا "آگے کم از کم اتنی ویرانی تو نہیں تھی"۔

میں پھر ہنس دیا۔ جواب کوئی نہیں دیا۔

سوچ کر بولا "وہ کہیں دکھائی دی؟"

میں چکرایا "کون؟"

"وہی"

اب میری سمجھ میں آیا کہ کسے پوچھ رہا ہے۔ طبیعت افسردہ ہو گئی "نہیں یار"۔

"اس کے بعد سے نظر ہی نہیں آئی"۔

"نہیں"

"تعجب ہے"۔

میں نے خود اس بات پر اس وقت کتنا تعجب کیا تھا۔ تعجب اور افسوس کر کے فارغ ہو گیا تھا۔ اب جو اس نے اظہار تعجب کیا تو مجھے پھر ایک مرتبہ تعجب ہوا کہ واقعی ایسی اوجھل ہوئی کہ پھر نظر ہی نہیں آئی۔

"یار تمہارے ساتھ بھی وہی ہوا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔"

"اور جو ہر شریف آدمی کے ساتھ ہوتا ہے"۔ میں نے ٹکڑا لگایا۔

ہم دونوں ہی افسردہ ہو گئے۔ پھر نہ اس نے کوئی بات کی نہ میرا بات کرنے کو جی چاہا۔ چپ بیٹھے رہے اور چائے پیتے رہے۔ بی بی سی کی خبروں کا وقت آیا اور نکل گیا۔ ریڈیو پاکستان، پھر آل انڈیا ریڈیو۔ سب خبروں کے وقت نکل گئے۔

"چلیں یار"۔

"ہاں چلنا چاہیئے"۔

ہم چل کھڑے ہوئے۔ وہ اپنے گھر کی طرف۔ میں اپنے گھر کی طرف۔

○

# بے سبب

بیوی نے اس کی طرف غور سے دیکھا "کس بات پہ ہنس رہے ہو؟"

"میں ہنس رہا ہوں؟ نہیں تو" وہ سٹپٹا گیا

"تو ہنس ہی نہیں رہے ہو۔ باچھیں تو کھلی جا رہی ہیں" رکی۔ پھر بولی "کوئی یاد آ رہا ہے"۔

"یاد کون آتا" وہ سٹپٹا کر چپ ہو گیا۔

کئی مرتبہ اس نے کوشش کی کہ بیوی ادھر ادھر ہو جائے تو دل کھول کر ہنسا جائے۔ مگر وہ ٹس سے مس ہی نہیں ہو رہی تھی ناشتے کے برتن باورچی خانے میں رکھے اور فوراً ہی واپس آ گئی رفتہ رفتہ اسے یقین آ گیا کہ گھر میں اسے ہنسنے کی آزادی میسر نہیں آ سکتی۔ پھر کہاں جایا جائے۔ گھر کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے باہر تصور دوڑایا اور ایسے مقامات کو دھیان میں لایا جہاں اطمینان سے ہنسنے کے امکانات تھے۔ اصل میں آج صبح ہی سے اس کا ہنسنے کو جی چاہ رہا تھا۔ دفتر آج اسے دیر سے جانا تھا۔ خیال یہی تھا کہ گھر میں اطمینان سے بیٹھیں گے اور ہنسیں گے۔ جب گھر کے اندر ہنسنے کے امکانات اس نے مسدود دیکھے تو اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمہیں تو دفتر آج دیر سے جانا تھا" بیوی نے ٹوکا

"ہاں مگر ایک دو کام باہر کے ہیں۔ سوچا کہ انہیں نبٹا لیا جائے۔ پھر ادھر سے ادھر ہی دفتر چلا جاؤں گا۔"

"جا رہے ہو تو بجلی کا بل بھی ادا کر دو۔ پرسوں آخری تاریخ ہے" یہ کہتے کہتے بیوی اٹھی۔ اندر گئی اور واپس آ کر بجلی کا بل اور رقم اس کے حوالے کر دی۔

جب وہ چلنے لگا تو بیوی کو پھر ایک کام یاد آ گیا۔ "اجی میں نے کہا کہ خالہ اماں کو منی آرڈر بھی تو بھیجنا تھا۔ بل ادا کر و تو وہیں کہیں ڈاکخانہ میں منی آرڈر بھی کر دینا" اور جلدی سے سو کا نوٹ اندر سے لا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

گھر سے نکل کر اس نے اپنے آپ کو آزاد محسوس کیا۔ اب میں اطمینان سے ہنس سکتا ہوں۔ سکوٹر سٹارٹ کرتے ہوئے ہنسی اس کے ہونٹوں پر کھیلنے لگی تھی کہ دفعتاً خیال آیا۔ کہ لوگ اسے سکوٹر پر ہنستا دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ آدمی سکوٹر پہ بیٹھا ہو اور ہنس رہا ہو تو کتنا عجیب سا لگتا ہے۔ بس اس خیال کے ساتھ اس نے ہنسی کو ملتوی کر دیا۔

بجلی کے بل کی ادائیگی کے لیے بنک ہی نہیں تو کاؤنٹر کے سامنے ایک پوری قطار کو پایا۔ وہ بھی قطار میں لگ گیا۔ قطار میں کھڑا رہا۔ بور ہوتا رہا۔ جیسے تیسے باری آ گئی۔

بل ادا کر کے ڈاکخانے پہنچا۔ منی آرڈر فارم لیکر اُسے پُر کیا۔ فارم پُر کرتے کرتے کاؤنٹر پہ اور کئی منی آرڈر بھیجنے والے آ کھڑے ہوئے۔ ایک کے بعد دوسرا۔ دوسرے کے بعد تیسرا۔ وہ سب سے پیچھے تھا۔ سب سے بعد میں اس کی باری آئی۔

بنک اور ڈاکخانے نے اسے بہت بور کر دیا تھا۔ سوچا کہ کسی ٹھنڈے گوشے میں بیٹھ کر چائے پی جائے کہ طبیعت بحال ہو۔ قریب ہی ریستوراں تھا۔ اس میں داخل ہو گیا۔ ٹھنڈا پانی پیا گرم چائے کا گھونٹ چڑھایا تب کہیں جا کر طبیعت بحال ہوئی طبیعت کی بحالی کے ساتھ ہنسنے کی خواہش عود کر آئی۔ مگر فوراً ہی خیال آیا کہ آس پاس کی میز سے کسی نے اسے ہنستے دیکھا۔ تو کیا سوچے گا

یہی کہ اس آدمی کا دماغ چل گیا ہے۔ اس نے ارد گرد نظر ڈالی۔ میزیں بھری ہوئی تھیں۔ یہ لنچ کا وقت تھا۔ سب کھانے میں مصروف تھے کسی چہرے پر کوئی ہنسی نہیں تھی۔ مجھے ہنسنے کی فرصت ہے۔ اس نے سوچا۔ مگر میں اکیلا ہوں۔

آدمی اکیلا ہو اور ہنس رہا ہو تو خواہ مخواہ شک ہوتا ہے کہ سنک گیا ہے۔ تو ہنسنے کے لیے دوسرے کی شرکت ضروری ہے۔ یہ عجب طرح کی پابندی ہے اس نے چڑ کر سوچا۔

سوچا دفتر چلنا چاہیئے۔ ہنسنے کے لیے دفتر سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ وہاں ہنسنے میں شرکت کرنے والے آسانی سے میسر آجاتے ہیں۔ دفتروں میں ان دنوں یہی کچھ ہوتا ہے فائلوں کے ڈھیر لگتے رہتے ہیں۔ دفتری وقت باتوں میں گزرتا ہے کبھی سیاسی مسائل پر بحث کبھی لطیفہ بازی۔ فاروقی کو کتنے لطیفے یاد ہیں۔ اسے بس بہانہ چاہیئے۔ شروع ہو جائیگا۔ مگر دفتر میں پہنچ کر اس نے اور ہی فضا دیکھی۔ مسئلہ یہ زیر بحث تھا کہ فاروقی کی سینیرٹی کو نظر انداز کر کے علی احمد کو جو فاروقی سے جونیئر تھا انیسواں گریڈ دیدیا گیا تھا۔ فاروقی کا موڈ سخت آف تھا۔

ایک بیزاری کے ساتھ وہ دفتر سے گھر کی طرف چلا۔ بس اسی بیزاری کے عالم میں اس کے ذہن میں ایک سوال اٹھ کھڑا ہوا کہ آخر وہ ہنسنا کیوں چاہتا ہے۔ ہاں آخر میں ہنسنا کیوں چاہتا ہوں۔ لیکن کیا ہنسنے کے لیے کسی سبب کا ہونا ضروری ہے۔ اسے یاد آیا کہ صبح جب اس کی بیوی نے اس سے پوچھا تھا کہ کیوں ہنس رہے ہو۔ اسے اس سوال سے کتنی گھبراہٹ ہوئی تھی۔ زندگی کے ہر مرحلہ میں ہر فعل پر یہ سوال کھڑا کرنا کہ کیوں کر رہے ہو کتنی فضول بات ہے آدمی کو کچھ کام ایسے بھی تو کرنے چاہئیں۔ جن کا کوئی مقصد نہ ہو۔ تو مجھے اپنے آپ سے یہ نہیں پوچھنا چاہیئے۔ کہ میں کیوں ہنسنا چاہتا ہوں۔ بس ہنسنا چاہتا ہوں، محض اور صرف ہنسنا کسی وجہ کے بغیر، سبب اور مقصد کے بغیر۔

اُس نے اپنے اس استدلال سے اپنے آپ کو قائل کر لیا تھا۔ مگر دل کے اندر ایک چور تھا دوسروں کو وہ کیسے قائل کرے گا۔ دوسرے ہنسنے اور رونے دونوں کی وجہ پوچھتے ہیں۔ تو دوسروں کو وہ کس طرح قائل کرے گا۔ دوسروں کو قائل کرنے کی تدبیر سوچتے سوچتے اس نے ارد گرد کا تصور

کیا۔ اور ہر طرف اسے وہ کچھ نظر آیا جس پر صرف ہنسا ہی جاسکتا ہے۔ ہنسنے کا اردگرد اتنا سامان ہوتے ہوئے کوئی کیوں پوچھے کہ کیوں ہنس رہے ہو اور کیوں۔ بتانے کی ضرورت پیش آئے کہ ہم کتنا ہنس رہے ہیں۔ اسے تعجب ہوا کہ فی زمانہ ہنسنے کا اتنا وافر سامان جو ہے، پھر بھی ہم کتنا کم ہنستے ہیں جیسے ہمارے نہ ہنسنے سے صورت حال کی مضحکہ خیزی جاتی رہے گی۔

گھر پہنچ کر اس نے حالات کو بہت سازگار پایا۔ اب نقشہ صبح سے بالکل مختلف تھا۔ بیوی باورچی خانہ میں مصروف تھی رات کے کھانے کی ہنڈیا خاصی دیر سے پڑھائی گئی تھی۔ اسے اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ اس کے پاس آکر بیٹھتی۔ اس تنہائی کو اس نے بہت غنیمت جانا۔ تنہائی بھی کتنی غنیمت ہوتی ہے۔ ایسے میں کہ کوئی دیکھنے والا نہ ہو کہ آپ کیا کر رہے ہیں آدمی کتنا آزاد محسوس کرتا ہے۔

اس نے یوں ہی ریڈیو آن کر دیا۔ سوئچ گھمانے لگا کبھی ایک سٹیشن لگا کبھی دوسرا سٹیشن کوئی خاص سٹیشن لگانا اور سننا مقصود نہیں تھا۔ وہ تو بس تقریباً سوئچ گھما رہا تھا۔ ایک سٹیشن سے ڈرامہ ہو رہا تھا۔ ڈرامہ کومیڈی کی قسم سے تھا۔ کچھ دیر اس نے ڈرامہ سنا اور خوش ہوا۔ پھر اس نے سوئچ گھمایا دوسرا سٹیشن لگ گیا۔ یہاں بچوں کی کہانی ہو رہی تھی۔ سننے والے بچے بیچ بیچ میں کھکھلا کر ہنستے۔ پھر اس نے سوئچ گھمادیا۔ ایک اور سٹیشن لگ گیا۔ کچھ گانے بجانے کا پروگرام ہو رہا تھا۔ گانے بجانے والی ٹولی ترنگ میں تھی خوشی سے رہی تھی۔

جو سٹیشن بھی لگ جاتا یہی اسے احساس ہوتا کہ وہاں سے خوشی نشر ہو رہی ہے۔ دنیا میں لوگ کتنے خوش ہیں۔ اس نے دل میں کہا۔ ہاں دنیا میں لوگ کتنے خوش ہیں، وہ بڑبڑایا اور اداس ہو گیا۔ بغیر کسی سبب کے۔

# کشتی

باہر مینہہ برس رہا تھا، اندر حبس بہت تھا۔ حبس سے پریشان ہو کر کسی کسی نے سر باہر نکالا، پھر فوراً ہی اندر کر لیا۔

"بارش کچھ کم ہوئی؟"

"بالکل کم نہیں ہوئی۔ اسی شور کے ساتھ ہوئے چلی جا رہی ہے۔ یہ بارش ہے یا قیامت ہے؟"

"اندر کے حبس سے تو بہر حال بہتر صورت ہے۔"

"کوئی بہتر صورت نہیں۔ اندر حبس باہر بارش۔ آدمی آخر کہاں جائے۔"

"سب کچھ تو ڈوب گیا۔ اب آخر بارش کیوں ہوئے چلی جا رہی ہے۔"

"ہم جو باقی رہ گئے ہیں۔"

"ہاں بس ہم ہی رہ گئے ہیں۔ مگر ہم ہیں کتنے انگلیوں پر گن لو۔ باقی تو چرند پرند ہی ہیں۔"

"ہاں باقی تو چرند پرند ہی ہیں۔ شاید اس لیے بھی حبس بہت ہو گیا ہے۔ جانوروں کے درمیان سانس لینا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کب تک ہم اس طور جانوروں کے درمیان بسر کرتے رہیں گے۔"

"ہاں پتہ نہیں کب تک بارش تو رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہی کتنے دِن گزر گئے کہ اسی ایک رفتار سے ہوئے چلی جا رہی ہے"۔

"شروع کس دن ہوئی تھی؟"

"کس دِن، ہاں کم از کم حساب تو کرنا چاہیے کہ کس دن شروع ہوئی تھی اور اب کتنے دِن ہو گئے سب نے اپنے اپنے طور پہ یاد کیا۔ پر کسی کو یاد نہ آیا کہ وہ کونسا دن تھا اور کونسی تاریخ تھی جب برسنا شروع ہوا تھا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اب کچھ اندازہ نہیں کہ کتنے دن سے سفر میں ہیں"۔

کتنے دن سے ہم سفر میں ہیں۔ سب سوچ میں پڑ گئے۔ کتنے دِن سے کتنے برس سے کتنی صدیوں سے بارش اور سفر میں یہی ہوتا ہے۔ لگاتار برسے تو لگتا ہے کہ برس برس سے برس رہا ہے اور برس برس برسے گا۔ سفر کے بیچ کوئی پڑاؤ نہ آئے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جنم جنم سے سفر میں ہیں۔

"بہر حال جس دِن بارش شروع ہوئی ہے اسی دن ہم گھروں سے نکلے تھے۔ سو اگر ہم میں سے کسی کو یہ یاد ہو کہ ہم نے کس روز اپنے گھروں کو چھوڑا تھا تو ......"

"گھروں کو؟"

گھروں کو چھوڑنے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ گھروں کا نام کسی کے لب پہ آیا تھا تو ہمارے گھر بھی تھے یہ سوچ کے وہ حیران ہوئے اور چھوڑے ہوئے گھر دفعتاً انکے تصوّر میں یوں اُبھرے جیسے ابھی ابھی وہ انہیں چھوڑ کر نکلے ہیں۔

"کاش وہ بھی میرے ساتھ سوار ہو جاتی۔ جانے اب کن پانیوں میں گھری ہو گی"۔

"وہ کون تھی؟"

"وہ جو زینے سے اُترتے ہوئے سیڑھیوں کے بیچ مجھ سے ٹکرائی تھی"۔ اور وہ سارا منظر اسکی آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ ہرنی جیسی آنکھوں والی کہ اپنے لبادے کے اندر دو پکے پھل لیے پھرتی تھی اور جب ان سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے اس نے اسے تھاما، تو لگا کہ دو گرم دھڑکتے پوٹے والی کبوتریاں اس کی مٹھیوں میں آ

گئی ہیں۔ دوسرے ہی لمحہ وہ اسکی گرفت سے آزاد تھی اور وحشی ہرنی کی مثال قلانچیں بھرتی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ پر بعد اسکے دہشت اس ہرنی کی کم ہوتی چلی گئی حتیٰ کہ بھری دوپہر میں ٹیلے کے پیچھے کھجور تلے وہ اس کے گرم بوجھ سے ڈھیتی چلی گئی۔

زینے، ڈیوڑھیاں، آنگن، ٹیڑھی ٹیڑھی راہیں، ٹیلے، پھلوں سے لدے، پرندوں سے بھرے اونچے پیڑ، ایک دم سے انہیں کتنا کچھ یاد آگیا تھا۔

"ان گھروں کو کیا یاد کرنا جو ڈھے گئے اور بہہ گئے"۔

ہاں یہ تو انہیں ابھی تک خیال آیا ہی نہیں تھا کہ جو پانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے گزر رہا ہے اس نے انکے گھروں کو کہاں چھوڑا ہوگا۔

"مگر ہم ان گھروں کو کیسے بھول جائیں کہ ہم نے ان گھروں میں بیٹھ کر اترنے والی دلہنوں کے لیے گیت گائے اور گزرنے والوں کے لیے گریہ کیا"۔

تب سب آنکھیں ڈبڈبا ئیں۔ پھر ان سب نے مل کر اپنے گھروں کو یاد کیا اور وہ روئے۔

"عزیزو، ان گھروں کی بربادی مقدر ہو چکی تھی"۔

"وہ کیسے؟"

تب گلگامش دو زانو ہو بیٹھا اور یوں گویا ہوا کہ ہمسفرو دیدہ عبرت نگاہ رکھتے ہو تو مجھے دیکھو کہ میں کون کون پر شور سمندروں سے گزر کر اس اقلیم میں پہنچا جہاں اتنا پشتم استراحت کرتا تھا۔ میں نے فریاد کی کہ اے اتنا پشتم میں نے سنا تھا کہ حرکت میں برکت ہے اور سفر وسیلہ ظفر ہے۔ پر مجھ درماندہ راہ نے حرکت کو بے برکت پایا اور سفر کو لاحاصل جانا جب کہ تو حیات جاودانی کے مزے لوٹتا ہے اور اس بہشت بنیاد اقلیم میں آرام کرتا ہے۔ یہ سخن سن اتنا پشتم نے تامل کیا۔ پھر یوں لب کشا ہوا کہ اے تیرہ بخت میں دیکھتا ہوں کہ رنج سفر نے تجھے ہلکان کر دیا ہے اور الم نے تیرے اندر گھر کر لیا ہے سو تو گھڑی بھر کے لیے دم لے، پھر مودب ہو بیٹھ اور گوش ہوش سے سن کہ کیونکر میں نے حرکت میں برکت دیکھی اور سفر کو وسیلہ ظفر جانا اور اس راہ حیات جاوداں پائی۔ میں نے اپنا گھر ڈھایا،

پھر کشتی بنائی۔ اس پر میں حیران ہوا یوں بولا کہ اے بزرگ یہ میں کیا سنتا ہوں۔ کہیں کوئی اپنے ہاتھوں سے بھی اپنا گھر ڈھاتا ہے۔ اتناپشتم یہ سنکر افسردہ ہوا۔ پھر بولا کہ میرے خداوند کی مرضی یہی تھی۔ وہ میرے خواب میں آیا اور خبر دی کہ انیلیل غصّے میں ہے کہ زمین پہ شور بہت ہوگیا ہے کہ یہ شور اسے سونے نہیں دیتا۔ سو اے اتناپشتم تیری عافیت اس میں ہے کہ اپنا گھر ڈھادے اور کشتی تعمیر کر، تو اے گلگامش گھر اپنا میں نے خداوند کی مرضی سے ڈھایا اور کشتی بنائی۔

تب انہوں نے سوچا اور یاد کیا کہ ہوا کیا تھا۔ ہوا یوں کہ زمین آدمیوں سے بھر گئی، آدمیوں سے نیز ظلم سے خداوند نے تو بس آدمی کو پیدا کیا تھا۔ پر اس نے آگے بیٹیاں پیدا کر ڈالیں اور خداوند کے بیٹوں نے ان بیٹیوں کو خوبصورت پایا اور اپنی جوروئیں بنا لیا اور ان بیٹیوں نے جوروئیں بن کر مزید بیٹیاں جنیں کہ مزید خدا کے بیٹے ان پہ ریجھے اور انہیں جوروئیں بنا کر اپنے گھروں میں لوٹے۔ پس اس طور زمین آدمیوں سے بھرتی چلی گئی۔ آدمیوں سے نیز ظلم سے اور ایسا ہوا کہ خداوند پچھتایا اور دلگیر ہوا اور پھر یوں بولا کہ میں نے آدم زاد کو بھر پایا۔ سو میں اب انسان کو جسے میں نے خلق کیا تھا نابود کر دوں گا کہ زمین بہت بگڑ گئی ہے اور ظلم سے بھر گئی ہے۔

پھر انہیں بگڑے ہوؤں کے بیچ ایک نیک بندہ تھا کہ خداوند کے ساتھ چلتا تھا اور خداوند نے اس سے کہا کہ اے لمک کے بیٹے میں تجھے بچاؤں گا۔ سو تو ایسا کر کہ ایک کشتی بنا اور دیکھ جب طوفان اٹھے تو ہر ذی روح کے ایک جوڑے کو اپنے ساتھ لے اور کشتی میں بیٹھ جا اور اس بندے نے ویسا ہی کیا۔ جیسا اس کے خداوند نے اس سے کہا تھا۔

پر وہ بندہ بھی جورو والا تھا اور اس جورو نے بیٹے جنے جنھوں نے بڑے ہو کر خوبصورت بیٹیوں کو اپنی جورو بنایا اور وہ جورو شوہر کو کشتی بناتے دیکھتی تو ٹھٹھا کرتی اور بیٹیوں کو جمع کر کے کہتی کہ تمہارے باپ نے یہ کیا کھڑاگ پھیلا رکھا ہے کہ دن بھر اور رات بھر لکڑیاں کاٹ کاٹ کے کچھ بناتا رہتا ہے۔

یہ طعنے سن سن لمک کے بیٹے نوح نے آخر زبان کھولی اور کہا کہ اے میری زندگی کی شریک

ڈر اس دن سے کہ نیرا گرم تند و ٹھنڈا ہو جائے اور تو آکر مجھے طوفان کی خبر سنائے اور بھور بھئے منوجی یہ دیکھ بھونچک رہ گئے کہ مچھلی بڑی ہوگئی ہے اور باسن چھوٹا رہ گیا ہے۔ کل ہی تو اشنان کرتے سمے ان کے چلو میں یہ مچھلی آگئی تھی کہ اس سمے چھنگلیا انگلی کے سمان تھی۔ وہ اسے پھینکنے لگے تھے کہ اس نے دہائی دی کہ پربھو شانتی۔ میں تمہارے شرن لینے آئی ہوں کہ میں چھوٹی مچھلی ہوں اور ندی اندر بڑی مچھلیوں کے بیچ نہیں رہ سکتی کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے انہوں نے اسے اپنے شرن میں لے لیا اور ایک کونڈے میں جل بھر کے اسے اس میں ڈال دیا۔ پر اب وہ دیکھ رہے تھے کہ کونڈا چھوٹا رہ گیا ہے اور مچھلی بڑی ہوگئی ہے۔

منوجی نے مچھلی کو کونڈے سے نکال کے گھڑے میں ڈال دیا اور پانی اس میں بھر دیا۔ پر اگلے دن بھور بھئے جب منوجی پوجا کے لیے اُٹھے، تو دیکھا کہ گھڑا چھوٹا رہ گیا ہے اور مچھلی بڑی ہوگئی ہے کہ دم اس کی گھڑے سے باہر نکلی ہوئی ہے اب انہیں اور بھی اچرج ہوا کہ تنک سی مچھلی بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی کہ گھڑے میں نہیں سمانی۔ مچھلی نے دہائی دی کہ پربھو کرپا کرو۔ گھڑے میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔

منوجی کی کٹیا کے باہر ایک جل کنڈ تھا۔ انہوں نے مچھلی کو گھڑے سے نکال کے جل کنڈ میں ڈال دیا اور نچنت ہوگئے۔ پھر اگلے دن انہیں چنتا لگ گئی۔ جل کنڈ سے چھوٹا رہ گیا تھا، مچھلی بڑی ہوگئی تھی کہ پونچھ اس کی جل کنڈ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ مچھلی نے پھر دہائی دی کہ پربھو تم نے مجھے اپنے شرن میں لیا ہے پر مجھے تمہارے شرن میں چین نہیں ملا۔ منوجی نے یہ سن کے مچھلی کو جل کنڈ سے نکالا اور نگر سے باہر تلیا میں کھسکا دیا۔ کہا کہ لے اب تو تلیا میں تیر اور چین کر۔

منوجی مچھلی کو تلیا میں چھوڑ کے گھر ایسے آئے جیسے سر سے بڑا بوجھ اُتار کے آئے ہیں۔ اس رات وہ چین سے سوئے۔ پر جب تڑکے میں ان کی آنکھ کھلی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مچھلی کی پونچھ تلیا سے نکل لمبی ہوتے ہوتے ان کے آنگن میں آن پہنچی تھی۔ وہ جھٹ پٹ اُٹھ تلیا پہ گئے۔ کیا دیکھا کہ تلیا چھوٹی رہ گئی ہے۔ مچھلی بڑی ہوگئی ہے۔ اتنی بڑی کہ تلیا کے اندر تو بس اس کا منہ تھا۔ باقی دھڑ اور پونچھ سب باہر۔ مچھلی بولی کہ ہے پربھو۔ تمہارے شرن میں میں تیرنے اور سانس لینے کو ترستی ہوں۔

منوجی نے مچھلی کو تلیا سے نکالا، مگر پہ لادا اور چلے گنگا ندی کی اور۔ وہاں جا کے انہوں نے اسے ندی میں چھوڑا اور کہا کہ ہے ری مچھلیا، میں نے تجھے گنگا میا کی گود میں دیا۔ میا کی گود میں چاہے سمٹ جا، چاہے پھیل۔ پر وہ ابھی یہ کہنے تھے کہ مچھلی پھیلنے لگی۔ اتنی پھیلی کہ گنگا میا کی گود چھوٹی رہ گئی۔ مچھلی بڑی ہو گئی۔

منوجی یہ دیکھ ہکا بکا رہ گئے۔ بولے کہ اری تو نرالی مچھلی ہے کہ پھیلتی ہی جا رہی ہے۔ جینے کا نیم یہ ہے کہ جتنی چادر دیکھے اتنے پاؤں پھیلائے۔ پر تیرے لچھن یہ ہیں کہ جتنا جل دیکھتی ہے اس سے زیادہ پھیل جاتی ہے۔ اچھا اب تیرا اپائے یہی ہے کہ میں تجھے ساگر کے بھینٹ کر دوں۔ یہ کہہ کے انہوں نے مچھلی کو گنگا کی گود سے لیا اور کندھے پہ لاد چلے ساگر کی اور۔

ساگر کی اور جاتے ہوئے منوجی کو دھیان کی لہر بہا کے بیتے سمے میں لے گئی جب وشنوجی بونے کے روپ میں پرگھٹ ہوئے تھے۔ انہوں نے اس دُشٹ راجہ سے تین ڈگ دھرتی مانگی تھی۔ اس مورکھ نے سوچا کہ بونے تین ڈگوں میں کتنی دھرتی جاتی ہے مانگ مان لو۔ یہ سوچ اس نے مانگ مان لی۔ پر وشنوجی ایک دم سے بونے سے دیو بن گئے۔ انہوں نے تین ڈگ ایسے بھرے کہ دھرتی اور آکاش دونوں تین ڈگوں میں سمیٹ لیے۔ اس دھیان نے منوجی اچونکا دیا۔ ایک سنسے کے ساتھ انہوں نے مچھلی کو دیکھا۔ پر تُرنت دھیان کی اک اور لہر آئی۔ جی میں کہا کہ اس سمے تو دھرتی راکششوں کے چنگل میں تھی سو وشنو مہاراج نے انہیں اس پرکار چھل دیا اور دھرتی کو ان کے چنگل سے نکالا۔ آج کے دُشٹ ایسے کون سے بڑے راکشس ہیں کہ وشنو مہاراج ایسا سوانگ بھریں گے۔ انہیں وہ چاہیں تو ابھی چیونٹیوں کے سمان مسل ڈالیں۔

بس یہی سوچتے سوچتے منوجی ساگر کنارے پہنچ گئے۔ مچھلی کو ساگر میں دھکیلا اور کہا کہ اب تو میرا بندھن چھوڑ، اس وشال ساگر میں جتنا من چاہے اتنا پھیل جا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ مچھلی پھیلنے لگی۔ پھیلتے پھیلتے پورے ساگر پہ چھا گئی۔

منوجی نے ایک بھے کے ساتھ یہ کچھ دیکھا۔ پھر شردھا سے ان کا سر جھک گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کے آنکھیں موند کے کھڑے ہو گئے اور لگے کہنے، پربھو شانتی۔ آواز آئی کہ ہے منو دھرتی ادھرمیوں

کے ہاتھوں اشانت ہے۔ پر تجھے شانتی ملے گی۔ سو تو ناؤ بنا جب ساگر امنڈے اور دھرتی ڈوبے تو پنچھیوں پکشوؤں میں سے ایک ایک جوڑا سنگ لے اور ناؤ میں بیٹھ جا۔

منوجی بیرسن بولے کہ ہے پربھو جب ساگر امنڈے گا تو میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی بودی نیا ڈول جائے گی یا بہہ جائے گی۔ آواز آئی کہ ہے منو تو اسے میری مونچھ کے بال سے باندھ دیجیو۔ بولے کہ باندھوں گا کاہے سے۔ میرے پاس کوئی رسی نہیں ہے۔ ترنت ایک سانپ رسی سمان لہروں میں لہرایا ہے منو یہ رہی رسی اس سے نیا باندھ لیجیو۔

تب زوجہ حضرت نوح کی حضرت کے پاس پہنچی۔ اس حال سے کہ اس کے ہاتھ آٹے میں سنے ہوئے تھے اور ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ یصد تشویش بولی کہ اے مرے والی۔ ہمارا گرم تندور ٹھنڈا ہو گیا ہے اور پانی اس کی تہہ میں سے اُبل رہا ہے۔ حضرت نے تامل کیا۔ پھر یوں بولے کہ دیکھ رب ذوالجلال کا دن آن پہنچا ہے۔ تو یوں کر کہ اپنے جنوں کو اکٹھا کر اور کشتی میں سوار ہو جا۔ اس پر وہ عورت یہ بولی کہ میں تندور پر طشت ڈھکے دیتی ہوں۔ پھر پانی نہیں اُبلے گا۔ یہ کہہ کے وہ دوڑی ہوئی اندر گئی۔ طشت اُٹھا کر کے تندور پہ ڈھکا اور اوپر اس کے بڑا سا پتھر رکھ دیا۔ یہ کر کے وہ باہر آئی اور اپنے والی سے بولی کہ دیکھ میری ترکیب کام آئی۔ پانی اُبلنا بند ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہتی تھی کہ پانی انگنائی سے نکل کے باہر امنڈنے لگا۔ طشت اور پتھر اس کے بیچ تیر رہے تھے، اور اسی ساعت ہمسایہ کے گھر والے کی زوجہ حواس باختہ آئی اور چلائی کہ میرے گھر کے تندور سے فوارہ چھوٹ رہا ہے کہ انگنائی میری جل تھل ہو گئی۔ پھر مختلف گھروں سے بیبیاں نکلیں اس حال سے کہ ہوش ان کے اڑے ہوئے تھے۔ ہر ایک کے لب پہ خبر یہ تھی کہ تندور ان کے گھر کا گرم سے ٹھنڈا ہوا، اور پانی اس سے اُبلنے لگا اور سیلاب باہر سے امنڈے تو اسے روکا جا سکتا ہے مگر جب گھر کے اندر سے پھوٹ پڑے، تو کیونکر اس پہ بند باندھا جائے۔

سو یوں ہوا کہ دم کے دم میں اس بستی کے سب تندور ٹھنڈے ہو گئے، اور وہ ایسا وقت تھا جب ابھی ابھی گھر والیوں نے اپنے اپنے تندور گرم کیے تھے ہر تندور میں انگارے دہک رہے تھے اور روٹیاں پک کر گرم گرم نکل رہی تھیں کہ دفعتاً ایک تندور ٹھنڈا ہوا۔ پھر دوسرا تندور ٹھنڈا ہوا، پھر کتنے ہی سارے

تندور میں آگ بجھی اور نمی پیدا ہوئی۔ پھر ہلکا ہلکا پانی رسنے لگا۔ پھر جیسے تہہ پھٹ گئی ہو۔ ایک دم سے پانی اُبلنے لگا۔ پانی تندوروں سے اُبلا، انگنائیوں میں امنڈا اور شاہراہوں میں پھیلا اور پھر بارش شروع ہو گئی ایسے جیسے آسمانوں کے سب دریچے کھل گئے ہوں تب حضرت نوحؑ نے کہا کہ بیشک خداوند کے قہر کا دن آن پہنچا ہے۔ اور تب حضرت نوحؑ نے کشتی نکالی، سب جانوروں کے جوڑوں کو اس میں بٹھایا اور زوجہ سے کہا کہ اے مری زوجہ دیکھ قہر کی ساعت آن پہنچی، تندور پڑ ڈھکا ہوا تیرا المشت پتے کی مثال پانی میں بہہ گیا اور آنگن تیرا پانی سے بھر گیا۔ اب یوں کر کہ اپنے جنوں کو اکٹھا کر اور کشتی میں سوار ہو جا۔

نسبردہ زوجہ یہ بولی کہ اے مرے والی اس گھر میں میں نے تیرے سنگ پانچ سو سے اوپر برس کھینچے، دن گزارے، راتیں بسر کیں۔ یاد کر کہ ہم دونوں نے مل کر اس گھر میں کتنے دکھ دیکھے اور کتنے سکھ پائے کتنی بار میں بار آور ہوئی، دودھوں نہائی۔ پوتوں پڑپوتوں کی بہاریں دیکھیں۔ سو نوحؑ کہ میں کیونکر اس گھر کو چھوڑ دوں۔؛

تب نوحؑ نے فرمایا کہ اے مری رفیقہ خانۂ ہستی بے بنیاد ہے اور گھر کہ آدم کے بیٹوں نے بنائے بودے ہیں، اور وائے خرابی میری کہ میں نے گھر بنایا بیچ ان لوگوں کے جن کے ظلم سے زمین بھر گئی اور ٹیڑھی ہو گئی۔ سو ڈھینا اس گھر کا مقدر ٹھہرا۔ سو اس سے پہلے کہ دیواریں اس کی بیٹھ جائیں اور چھت اس کی آن پڑے، تو یہاں سے نکل اور کشتی میں بیٹھ کہ آج زمین و آسمان کے بیچ وہی ایک پناہ گاہ ہے۔؛

یہ سن زوجہ ان حضرت کی ڈھیٹ ہو کے یہ بولی کہ اگر میرا گھر مجھے پناہ نہیں دے سکتا تو پھر مجھے کہاں پناہ ملے گی۔

تب حضرت اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ اے مرے بیٹو، تمہاری ماں نے تو زمین پکڑ لی ہے اور ہلاک ہونے والوں میں شامل ہو گئی ہے تم باپ کی سنو اور جلد کشتی میں بیٹھ جاؤ مبادا تم بھی نافرمانوں میں شمار کیے جاؤ اور ہلاکت کے گھیرے میں آ جاؤ۔

یہ سن سب بیٹے کشتی میں سوار ہوئے سوائے بڑے بیٹے کنعان کے کہ اس نے ماں کی راہ کو اپنایا اور

باپ سے کہا کہ اے مرے باپ میں کیونکہ اس گھر کو جس میں مری نال گڑی ہے چھوڑ کر اور کیونکر اس مٹی سے جس نے مجھے رس اور جس دیا ہے منہ موڑ کر اس کشتی میں سوار ہو جاؤں جس میں تو نے ہر رنگ کا جناور جمع کر لیا ہے۔

حضرت نے بیٹے کی بات سن کے کہا کہ اے مرے بیٹے دیکھ یہ قہر کا دن ہے سو انسان اور حیوان سب ایک کشتی میں سوار ہیں کہ طوفان بے امان ہے اور زندگی کی ضمانت اس کشتی کے سوا کہیں نہیں ہے۔

بیٹا بولا کہ اے مرے باپ تنہائی کی موت ہجوم کے ساتھ زندہ رہنے سے بہتر ہے اور گھر کے اندر پانی میں غرق ہو جانا اچھا ہے۔ بہ نسبت اس کے کہ آدمی اجنبی پانیوں میں جانوروں کے درمیان بسر کرے۔

تب حضرت نوح اپنی بی بی سے اور اپنے بیٹے سے مایوس ہوئے کہ انہوں نے زمین پکڑی اور نافرمانوں میں شمار ہوئے، اور تب کشتی رواں ہوئی اور حضرت نے کہ سلام ہو اس پر ہمارا سامڑ کے بعد پاس اس گھر کی جانب دیکھا جسے وہ چھ سو برس تک رس بس کر چھوڑ رہے تھے اور انہوں نے دیکھا کہ ان کے باپ کا بنایا ہوا بڑے سہاگ والا وہ گھر کہ کل تک شاد آباد تھا اب امنڈتی موجوں کے بیچ خالی ڈھنڈار پڑا تھا، اور ان کی زوجہ نے اور ان کے بیٹے نے برستے آسمان تلے چھت پہ پناہ لی ہوئی تھی، پھر یوں ہوا کہ وہ گھر آنکھوں سے اوجھل ہوتا چلا گیا اور پانی کا زور بڑھتا چلا گیا۔

مینہ ایسے برسا جیسے آسمان کے سب دروازے اور دریچے چوپٹ کھل گئے ہوں۔ مینہ دن برسا رات برسا دن دن برسا۔ لگاتار برسا کہ دن اور رات کا صبح اور شام کا، دن اور دن کا فرق مٹتا چلا گیا اور زمین نظروں سے یوں اوجھل ہوئی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

پھر یوں ہوا کہ کوے کو کشتی کے اندر بیٹھے بیٹھے بیکلی ہوئی۔ اس نے پر پھڑپھڑائے اور کائیں کائیں کرتا، باہر اڑ گیا۔ مگر چکر کاٹنے کے بعد پھر واپس آ گیا، اور اس کی واپسی اعلان تھی کہ اب کہیں خشکی نہیں ہے کہ پنجے ٹکائے جا سکیں۔

پھر چوہوں کے جوڑے کو بیکلی ہوئی۔ انہوں نے پوری کشتی کا چکر کاٹا کہ کہیں کوئی بل ملے اور وہ اس میں سٹک جائیں پر انہوں نے کشتی میں کوئی بل نہ پایا۔ مگر بل تو ہونا چاہیئے۔ کہ وہ اس میں سٹک سکیں، یہ

سوچ انہوں نے کشتی کے پیندے کو کترنا شروع کر دیا۔ کشتی کے جانور یہ دیکھا اور ہراساں ہوئے یہ سوچ کر کہ مبادا کشتی میں چھید ہو جائے اور اس میں پانی بھر جائے اور وہ غرق ہو جائے۔ تب انہوں نے فریاد کی حضرت نوحؑ سے اور افسوس کیا حضرت نوحؑ نے کہ وائے خرابی میری کہ میں نے کشتی میں سوار کیا چوہوں کو جن کا شیوہ ہی یہ ہے کہ کترو اور سوراخ کرو۔ حضرت نے انہیں اس فعل سے باز رہنے کی ہدایت کی، مگر وہ باز نہ آئے۔ تب حضرت نے تنگ آ کر شیر کے منہ پہ ہاتھ پھیرا کہ ہاتھ پھیرتے ہی نکلی اس کے نتھنوں سے ایک بلی کہ جھپٹی چوہوں پر اور چٹ کر گئی انہیں دم کے دم میں۔

تب کشتی کے سب جانوروں نے شادمانی کی اور بلی پر آفریں بھیجی کہ اس نے انہیں آنے والی تباہی سے بچا لیا۔ پھر یوں ہوا کہ اسی ساعت کبوتری نے پر پھڑپھڑائے اور کشتی سے باہر نکل اڑ گئی۔ اور دیکھا انہوں نے کہ مینہ تھم گیا ہے اور کبوتری زیتون کی پتی چونچ میں دبائے واپس آ رہی ہے اور وہ شادماں ہوئے یہ سوچ کر کہ پانی اترنے لگا ہے اور خشکی نمود کرنے لگی ہے، مگر پھر انہوں نے یہ دیکھا کہ جونہی وہ زیتون کی پتی سمیت کشتی میں اتری تو نہی بلی اس پر جھپٹی اور اسے چٹ کر گئی۔ یہ کیا ہوا انہوں نے دیکھا اور دم بخود رہ گئے۔ ساتھ میں زیتون کی پتی بھی عجیب بات ہے۔

"اب ہم بیچ پانیوں میں ہیں، اور کوئی یہ بتانے والا نہیں ہے کہ خشکی کہاں ہے"۔

مینہ بے شک تھم گیا تھا۔ بادل کی گرج کتنی دیر سے سنائی نہیں دی تھی۔ مگر پانی کی دھار اسی شور سے گرج رہی تھی اور اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے گزر رہی تھی۔ کسی کسی نے سر نکال کر باہر دیکھا، پھر فوراً ہی اندر کر لیا۔ "بہت پانی ہے"۔

اندر حبس بہت تھا اور بلی بیٹھی تھی۔ باہر پانی گرج رہا تھا اور زمین و آسمان ملے نظر آ رہے تھے۔ زمین و آسمان اور زمین و زمان۔ لگتا تھا کہ ایک زمانہ ہو گیا انہیں گھروں سے نکلے ہوئے اور ایک زمانہ ہو گیا انہیں پر شور پانیوں کے بیچ ڈولتے ہوئے۔

"کیا ہم کبھی واپس نہیں جا سکیں گے؟"

"کہاں؟"

"اپنے گھروں کو"

اپنے گھروں کو؟ ایک بار پھر انہیں حیرانی نے آلیا۔ گھر۔ ایک بار پھر گھروں کی یاد نے انہیں ایسے آلیا جیسے کوئی بڑا جھکڑ پیڑوں کو آلے اور انہیں ہلا دے۔

"عزیزو! کون سے گھر۔ باہر جھانک کے دیکھو۔ کوئی بستی کوئی دیوار و در کہیں دکھائی پڑتے ہیں۔ کیا تم نے گلگامش سے نہیں سنا کہ اتناپشتم نے گھر ڈھا کر کشتی بنائی تھی؟"

"اتناپشتم نے اچھا نہیں کیا"

"ہاں مگر اتناپشتم کے خداوند کی تو تسلی ہو گئی کہ اب زمین پر پانی کے شور کے سوا کوئی شور نہیں ہے کہ اس کی نیند میں خلل ڈالے"

مارکنڈے نے باہر جھانک کے دیکھا۔ چاروں اور گھور اندھیرا۔ اندھیرا اور سناٹا اور جل کی گرجتی دھارا۔ پرم آتما نیند میں تھی اور اننت ناگ کے پھن پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے سر اندر کر لیا۔ نارائن۔ گہراؤ کے اوپر اندھیرا تھا۔ اور خداوند کی روح پانیوں پر جنبش کرتی تھی۔ پانی جس کا کوئی اور چھور نہیں تھا پانی کی گرجتی دھار میں ازل اور ابد کے ڈانڈے مل جاتے ہیں اور زمین اور زماں گھل مل جاتے ہیں۔ انہیں کچھ یاد نہیں تھا کہ کب سے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں اور کب سے پر شور پانیوں میں بہہ رہے ہیں تنکوں کی طرح۔ اور کوا پھر بیکل ہوا۔ پر پھڑپھڑائے کو اڑ گیا اور لوٹ کے نہیں آیا۔ انہوں نے باہر جھانک کے دیکھا۔ مینہ بے شک تھم گیا تھا۔ مگر پانی اسی طرح امنڈا ہوا تھا۔ اور گرج رہا تھا۔ کوے کا دور دور پتہ نہیں تھا۔

"کوا سیانا جانور ہے۔ وہ لوٹ کے نہیں آئے گا"

"خیر یہ تو پتہ چل ہی گیا کہ کہیں نہ کہیں خشکی ہے سو ہماری کشتی بھی کسی نہ کسی کنارے جا ہی لگے گی۔ سوائے ہمارے رب ہمیں برکت کی جگہ اتار لیو اور تحقیق تو سب سے بہتر اتارنے والا ہے"

"ہمسفرو۔ برکت کی جگہ کہاں ہے ہم گہرے پانیوں کے بیچ میں ہیں اور کوئی یہ بتانے والا نہیں کہ

خشکی کہاں ہے اور برکت کی جگہ کونسی ہے ہاں اگر نوح ہمارے بیچ میں ہوتا تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"نوح؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نوح یہاں نہیں ہے"

"نہیں"

سب نے خوف بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، نوح کہاں ہے تب حاتم طائی نے زبان کھولی اور یہ کلام لب پر لایا کہ "اے ہمسفران عزیز" اے عزیزان با تمیز، صبر کا دامن ہاتھ سے مت چھوڑو۔ دیکھتے رہو کہ پردہ غیب سے کیا نمودار ہوتا ہے۔ مجھے دیکھو کہ میں نے بھری ندیوں کے بیچ ایسی کشتیوں میں سفر کیا ہے۔ جن کا کوئی کھویا نہیں تھا۔ کان دھر کر سنو کہ وہ ندا کی مہم میں مجھ پہ کیا بیتی حیران و سرگرداں چلا جاتا تھا۔ کہ ایک پہاڑ بلند عظیم الشان نظر آیا۔ اسی کی طرف متوجہ ہوا۔ تین دن کے بعد اس کے نیچے جا پہنچا، اور جس پتھر کو اٹھا کر دیکھا اس کے تلے لہو بہتے پایا۔ فکر کرتا تھا کہ کوئی یہاں نہیں ہے جس سے اس کا احوال پوچھوں۔ پھر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دریا بڑے زور و شور سے بہہ رہا ہے اور اس کا اور چھور بھی نہیں ملتا۔ نہایت متفکر ہوا۔ دل میں کہا کہ یا الٰہی اب اسے کیونکہ پار اتروں اتنے میں ایک ناؤ نظر پڑی کہ ادھر ہی چلی آتی ہے جانا میں نے کہ کوئی ملاح لیے آتا ہے جب کنارے آ لگی تو اس پر کسی کو نہ دیکھا۔ متعجب ہوا۔ پھر شکر خدا کا بجا لا کر سوار ہو لیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دسترخوان میں کچھ لپٹا دھرا ہے۔ بھوکا تو تھا ہی، فوراً ہاتھ بڑھا کر کھولا، تو دو گرم گرم نان اور کباب حیران ہوا کہ یا الٰہی یہ گرم نان کس تندور سے آئے ہیں۔ دھیان آیا کہ شاید ملاح نے اپنے واسطے رکھا ہو۔ پرائے کا حق کھانا خوب نہیں اتنے میں ایک مچھلی نے دریا سے سر نکال کر کہا کہ اے حاتم یہ روٹیاں اور کباب تیرا ہی رزق ہے۔ شوق سے کھا۔ کچھ اندیشہ جی میں نہ لا۔ یہ کہہ کر غوطہ مار کر کھو گئی۔ میں حیران کہ کشتی کون لایا۔ کباب روٹی کون دھر گیا۔ مچھلی کون تھی؟"

"مچھلی؟" سب چونک پڑے۔ مچھلی تو ان کے دھیان سے اتر ہی گئی تھی۔

"مچھلی کون تھی۔ ہاں پہلے تو بر متوجہ ہو چپک رہ گئے تھے۔ پر پھر اسی کی مونچھ کے بال سے انہوں

نے ناؤ کو باندھا۔"

سب نے باہر جھانک کے دیکھا۔ باہر چاروں اور گھور اندھیرا اور اندھیارا اور گرجتے جل کی دھارا۔ مانو بھوساگر امنڈ انتھا۔ پر مچھلی کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔

"مچھلی تو کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔"

"مترد اسے ڈھونڈو۔ اسی کے بال سے تو ہم بندھے ہوئے ہیں۔"

سب نے باہر دُور تک دیکھا۔ بس لہراتی رسی دکھائی پڑی مچھلی کہیں نہیں تھی۔ "مترو رسی تو ہے کہ سانپ سمان ناؤ کے چاروں اور لہرا رہی ہے۔ پر مچھلی نہیں ہے۔"

"یہ تو بہت چنتا کی بات ہے۔"

سوچنتا نے انہیں گھیرا اور سنسے نے آن پکڑا۔ دُور دُور کی بات دھیان میں آئی پر گتھی نہ کھلی۔ ناؤ ڈول رہی تھی۔ اور چاروں اور جل کی دھارا گرج رہی تھی۔



# نئے افسانہ نگار کے نام

میرے عزیز میرے حریف نئے افسانہ نگار بلراج مینرا نیا افسانہ تمہیں مبارک ہو مگر ع

مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانۂ تست

تم نے باقر مہدی کو بیچ میں ڈال کر مجھ سے جواب طلبی کی ہے۔ تمہارے بیان کے مطابق وہ کہتے ہیں کہ "انتظار حسین کی داستان یا کتھا علامتی اور تجریدی افسانے کے لئے بہت بڑا چیلنج ہے"۔ ابھی میں نے ان کے رسالے میں ان کا مضمون پڑھا ہے جس میں انہوں نے اپنا بیان دہرایا ہے اور لکھا ہے "نئے افسانے کا مقابلہ ترقی پسند افسانے سے نہیں ہے بلکہ داستانوی کہانی سے ہے جس کے نمائندے انتظار حسین ہیں"۔

تم مجھ سے بیان صفائی چاہتے ہو۔ چلو منظور۔ مگر باقر مہدی بیچ میں آن ہی کودے ہیں تو میں پہلے ان سے ذرا اپنی زبان کا حساب صاف کرلوں۔ انہوں نے پچھلے دنوں میرے افسانے کچھوے کی زبان کو سنسکرت آمیز ہندی بات کہا تھا۔ اس بیان سے اس عزیز کی اردو فہمی کا پتہ چلا۔ یوں مجھے اب اردو ہندی قضیئے کی فضا سے نکل آنے کے اتنے زمانے بعد ہندی سے

کہ نہیں رہی ہے۔ ہندی لکھنے میں یا ہندی میں لکھنے میں اب مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آتی مگر افسوس کہ میری اس زبان سے آشنائی نہیں ویسے سنسکرت نہ جاننے کا زیادہ افسوس ہے۔ جتنی اور جیسی کچھ جانتا ہوں اردو ہی جانتا ہوں۔ ہاں یہ ہے کہ اینڈھن کو اینڈھن لکھتا ہوں ہیزم نہیں لکھتا۔ بھیڑ کو بھیڑ اور تنبیئے کو تتیا کہتا ہوں۔ زنبور نہیں کہتا۔ شکر صد شکر کہ میں نے اردو حضرت جوش ملیح آبادی اور ن۔ م۔ راشد سے نہیں پڑھی ہے اور اردو کی تاریخ کو رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو سے نہیں سمجھا ہے۔ اردو میں نے اپنی بستی کی خلقت سے سیکھی ہے اور میر، میر ابائی، کبیر اور نظیر سے پڑھی ہے اور بیتال پچیسی ڈاکٹر گیان چند کے اس انتباہ کے باوجود پڑھی ہے کہ اس کی زبان اردو نہیں ہے۔ میری بستی کی خلقت کوثر میں دھلی زبان نہیں بولتی تھی۔ وہ لکھنؤ والے بولتے ہوں گے میں نے کبھی کوثر میں دھلی زبان بولنے اور لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں زبان کو بہت دھونے اور پاک کرنے کا قائل نہیں۔ لکھنؤ کے پاکبازوں نے اس چکر میں اردو کے کتنے زندہ لہجوں اور لفظوں پر جھانواں پھیر ڈالا اور زبان کی تاریخ مرتب کرنے والوں نے کیسے کیسے شاعر کو اردو سے ہندی کی طرف دھکیل دیا۔ باقر مہدی ایسی ہی تاریخوں پر پلے ہیں اور جوش کی منظومات کو پڑھ کر بڑے ہوئے ہیں۔ انہیں کچھوے، کی زبان سنسکرت آمیز ہندی ہی نظر آئے گی۔

اصل میں مجھے باقر مہدی کے اپنے بارے میں مختلف بیانات پڑھ کر یہ اندیشہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے گوناگوں تعصبات کے چکر میں مجھے کسی ایک کھونٹے سے باندھ دینا چاہتے ہیں۔ مجھے خوب احساس ہے کہ جب سے ہمارے ادب میں تحریکوں کی وبا پھیلی ہے ادیب کسی ایک کھونٹے سے بندھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس میں فریقین کو سہولت رہتی ہے۔ بندھے ہوؤں کو بغیر تگ و دو کے مشین سے کٹا چارہ میسر آجاتا ہے دوہنے والے آسانی سے دودھ دوھ لیتے ہیں مگر میں کسی تحریک کا ڈنگر نہیں کوئی نظریاتی جانور نہیں۔ نظریوں سے مجھے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کسی مرغوب نظریے کی تبلیغ کی خواہش بھی ہو سکتی ہے مگر اس خواہش نے مجھے کبھی اتنا حیوان نہیں بنایا کہ افسانے کو پروپیگنڈے کی سطح پر لے آنے پر تل جاؤں۔ میں افسانے میں نظریئے کے کاندھے پہ بندوق رکھ کر نہیں چلاتا۔ میرے لیے

تجربے کی غلیل بہت ہے۔ افسانہ اس حقیر فقیر پر خیالات عالیہ کی صورت میں نازل نہیں ہوتا۔ واردات بن کر گذرتا ہے۔

باقر مہدی نے مجھے نئے افسانے کا تمغہ عطا نہیں کیا۔ ٹھیک کیا۔ میں اس اعزاز کا مستحق نہیں ہوں۔ میں تو ماقبل تاریخ زمانوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں اور ان بزرگوں سے کہانی کا فن سیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں جن کا فکشن کی تاریخ میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اسے نئے افسانہ نگار اسے مرے عزیز مجھے پتہ ہے کہ نئے افسانہ نگار کے حصے میں بھی کچھ اذیتیں آتی ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو نیا افسانہ کیسے وجود میں آتا۔ اردو افسانہ وہی ۳۶ء والی لکیر کا فقیر بنا رہتا۔ اب بھی کتنے ہیں جو اسی لکیر کو پیٹے جا رہے ہیں حالانکہ سانپ نکل چکا ہے۔ مگر جو چھوٹی سی اذیت اس فقیر کے نصیب میں لکھی گئی ہے وہ تمہیں عطا نہیں ہوئی یعنی نہ مینرا کو نہ سریندر پرکاش کو نہ اپنے پاکستان کے انور سجاد کو۔ بس اس اذیت نے مجھے کام کا آدمی نہیں رہنے دیا ورنہ میں بھی افسانے کی نئی تکنیکیں سیکھ کر نیا افسانہ نگار بننے کی کوشش کرتا۔ میں اپنی مصیبت میں زمینوں اور زمانوں میں آوارہ پھرتا ہوں۔ کتنے دنوں اجودھیا اور کربلا کے بیچ مارا مارا پھرتا رہا یہ جاننے کے لیے کہ جب بھلے آدمی اپنی بستی کو چھوڑتے ہیں تو ان پر کیا بیتتی ہے اور خود بستی پر کیا بیتتی ہے۔

اسی طرح آوارہ پھرتے پھرانتے میں مہاتما بدھ کی جاتکوں میں جانکلا اور ششدر رہ گیا کہ یا میرے مولا یہ کونسی دنیا ہے واردات ہے جہاں آدمی ان گنت زمانوں میں اور ان گنت قالبوں میں زندہ و تابندہ ہے۔ بیکراں وقت میں رنگا رنگ پیکروں میں پھیلی ہوئی بیکروں انسانی ذات۔ میں نے مڑ کے تمہارے نئے زمانے اور نئے آدمی کو دیکھا۔ چڑیدی چڑیدی کا شور ہے۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ میں اب اگر تمہارے نئے زمانے میں واپس آیا تو اس افسوس کے ساتھ واپس آؤں گا کہ کس وسیع و عریض کائنات سے نکل کر ستم زدوں کے کس جہان میں آگیا۔

جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے

اللہ اگر توفیق دے تو جاتکوں سے یہ شعور پا کر آج کے آدمی کے کرب کو سمجھا تو جا سکتا ہے

لیکن مجھے تو اپنی مصیبت پڑی ہوئی ہے میں جاتکوں کی کائنات میں حیران پھرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیا میرے ساتھ بھی یہ جنم جنم کا قصہ ہے۔ کس کس جنم میں کس کس بستی سے نکلا اور کہاں کہاں جا کر بسا۔ مگر میں تو اپنے پچھلے جنم بھول چکا ہوں۔ بس جہاں تہاں سے کوئی واقعہ کوئی بات یاد آجاتی ہے۔ میں نے ایک کہانی آخری آدمی لکھی یاروں نے لعن طعن کی کہ یہ ماضی پرست کس ماضی میں پہنچ گیا۔ پھر کہا کہ یہ اشرف المخلوقات کی تذلیل کی گئی ہے پھر کہا کہ اصل میں یہ علامتی کہانی ہے پھر کہا کہ آخری آدمی۔ یہ شخص خود ہے۔ یہ آخری بات میرے دل میں گھر کر گئی۔ واقعی آخری آدمی تو میں خود ہوں۔ یہ علامتی افسانہ نہیں۔ جاتک کہانی ہے۔ میری جنم کتھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں بنی اسرائیل میں پیدا ہوا تھا اور سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا کرتا تھا۔ مگر مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ میں نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کرنے کے سوا اور اور جنم میں اور پاپ بھی کئے تھے سو مجھے ہر جنم میں خوار ہونا پڑا۔ میں ان سب خواریوں کو یاد کرنا چاہتا ہوں۔ کیوں؟ اس لیے کہ میں اپنے آپ کو اکٹھا دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان سب خواریوں کو اپنی سب مسخ شکلوں کو یکجا کر کے دیکھنا چاہتا ہوں کہ میں کل ملا کر کیا بنتا ہوں۔ کاش مجھے اگلے پچھلے سب اپنے زمانے یاد آجائیں اس طرح جیسے ہاتھی کے حافظہ میں اس کے پچھلے جنم منور ہوتے ہیں۔ پھر میں سیدھے سچے لفظوں میں کہانی لکھوں کہ جنم جنم پہلے کی بات ہے کہ بنارس نگری کے راج سنگھاسن پہ دیودت بیٹھا راج کرتا تھا اور نرناری پشو پنچھی سب اس کے ابیائے کی چکی میں پستے تھے اور میں . . . .

تو اگر باقر مہدی کو میری کہانی پر لیبل لگانے کا ایسا ہی شوق ہے تو وہ اسے جاتک کہانی کہہ سکتے ہیں۔ داستانوی کہانی، کا نام میرے افسانوں کے سلسلہ میں کفایت کرتا نظر نہیں آتا۔ میری جاتک کہانی نئے افسانے کے ذیل میں آتی ہے یا نہیں آتی۔ پرانی کہانیوں کے ذیل میں جاتی ہے یا کس ذیل میں۔ یہ میں نے کبھی سوچا نہیں۔ ہاں ایک بات کہوں۔ مجھے بعض نئی لکھی ہوئی تحریریں بہت پرانی دھرانی نظر آتی ہیں۔ بعض بہت پرانی تحریریں نئی لگتی ہیں۔ جب میں نے جاتک کہانیاں پڑھیں تو لگا کہ میں بالکل نئی طرز کا فکشن پڑھ رہا ہوں۔ لارنس نے انجیل کو ایک

ژولیدہ و پیچیدہ عظیم ناول سمجھا تھا میں نے مہاتما بدھ کو نیا افسانہ نگار جانا جوائس کافکا اور کامیو سے الگ مگر جب میں تیس برس پہلے کا نیا اردو افسانے پڑھتا ہوں تو لگتا ہے کہ میں کسی دقیانوسی زمانے کا ادب پڑھ رہا ہوں۔

ہاں ایک اندیشہ ہے۔ میں جاتک کہانیاں لکھوں اور آپ کہیں کہ یہ شخص اپنے آپ کو دہرا رہا ہے حالانکہ یہ تو ہے ہی تکرار کا عمل۔ اور قرۃ العین حیدر نے تو مہاتما بدھ کی جاتکوں کے بارے میں بھی آسانی سے کہہ سکتی ہیں کہ بدھ نے اپنے آپ کو دہرایا بہت ہے۔ مجھے کلیات میر پڑھتے ہوئے دوسرے ہی دیوان میں لگا تھا کہ میر صاحب اپنے آپ کو دہرا رہے ہیں۔ پتہ نہیں مشرق والوں پر یہ کیا خدا کی مار ہے کہ اپنے آپ کو دہراتے بہت ہیں۔ ان لوگوں کے ادب میں ایسے ارتقائی مدارج نظر نہیں آتے جیسے مغربی ادب کی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ خیر یہ علمی بحث ہے جو میرے بس کی بات نہیں ہے واپس اپنی کھال میں آتا ہوں۔ جب میں کچھوے لکھ رہا تھا تو مجھے خواب احساس تھا کہ میں اس سے پہلے ایک کہانی زرد کتا لکھ چکا ہوں۔ تم پوچھو گے پھر یہ کہانی کیوں لکھی۔ پتہ نہیں۔ شاید یہ وجہ ہو کہ مجھے یہ شک پیدا ہو گیا تھا کہ یہ آدمی کی بنیادی خرابی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ جس تہذیب کے سیاق و سباق میں یہ بات ہوئی ہے اس تہذیب کی تعمیر ہی میں خرابی کی کوئی صورت مضمر تھی کہ اس کے بطن سے زرد کتا پیدا ہو گیا۔ اس تشویش میں سوچا کہ چلو کسی دوسری تہذیب میں چل کر دیکھتے ہیں کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ تو میں پیچھے چلا اور یہ دیکھنا شروع کیا کہ جب میں بدھ دیو جی کے سنگھ میں تھا تو ان کی آنکھ بند ہونے کے بعد میں کیا کر رہا تھا۔ اگر خدا مجھے توفیق دے تو میں تہذیبوں میں لمبے سفر کروں اور دیکھوں کہ تہذیبیں بوریا سے قالین تک کا سفر کیسے طے کرتی ہیں کب کس موڑ پر زرد کتا نمودار ہوتا ہے اور کیسے بلندیوں میں اڑتے اڑتے ڈنڈی داتنوں سے سر کٹنے لگتی ہے۔

بات سے بات نکل کر کہاں نکل گئی۔ مبادا بالکل بہک جاؤں واپس آتا ہوں۔ ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ میں جاتک کہانی لکھتا ہوں۔ یہ نئی ہے یا پرانی پتہ نہیں۔ اتنا پتہ ہے

گزشتہ کی حقیقت نگاری والی کہانی سے اس کا کوئی ناتا نہیں ہو سکتا کہ جاتک کہانی حقیقت کے اس محدود تصور کی نفی ہے جس پر مذکورہ حقیقت نگاری کی عمارت کھڑی ہے و نیز اس انسان دوستی کی جو مذکورہ افسانے کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے۔ جاتک کہانیاں پڑھنے کے بعد گزشتہ کی انسان دوستی مجھے فرقہ پرستی نظر آتی ہے۔ جاتکوں میں آدمی لوگ کوئی الگ فرقہ نہیں ہے۔ سب مخلوقات ایک برادری ہیں۔

تو اپنی جاتک کہانی کا حقیقت نگاری والے افسانے سے تو کوئی ناتا نہیں۔ علامتی اسلوب سے کیا رشتہ داری ہے۔ میں کیوں بتاؤں۔ تم خود بوجھو مگر باقر مہدی کہتے ہیں کہ میری کہانی سے نیا افسانہ خطرے میں پڑ گیا ہے۔ واقعی؟ میری کہانی نئے افسانے کے لیے چیلنج ہے پتہ نہیں میں تو یہ جانتا ہوں کہ میری کہانی بالآخر میرے ہی لیے چیلنج بن جاتی ہے۔

مگر اتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد میں اور ہی کچھ سوچ رہا ہوں۔ بھائی میرے یہ نیا اور پرانا کیا ہوتا ہے۔ ماضی اور حال، گزرا ہوا زمانہ اور نیا زمانہ عہدِ قدیم اور عصرِ حاضر، یہ کیسی تفریق ہے۔ یوں وقت کا فلسفہ میں نہیں سمجھتا۔ مگر ایک بھلے آدمی مورس نکل کی کتاب Time ( LIVING میں (اس سے یہ نتیجہ مت نکال لینا کہ میں نے ایسی تفلسف و فلسف کی کتابوں کو بالاستیعاب پڑھا ہے) میں نے ایک بات پڑھی اور جی کو بہت لگی کہ یہ ساری تاریخ ایک جیتا جاگتا آج ہے۔ یہ ساری فکرِ انسانیت کے آج میں سانس لے رہی ہے۔ ہمارا یہ ننھا سا آج جسے ہم ترقی کی معراج جانتے ہیں خود آج کا ایک چھوٹا سا جز ہے یا اس کا مطلب۔ تو یہ ہوا کہ ہم مورکھوں نے اپنے مورکھ پن سے آج کو کل بنا دیا ہے۔ پورے آج میں سانس لینے کی ہمت جو نہیں رہی۔ بس اپنی بساط بھر چھوٹا سا آج اس میں سے تراش لیتے ہیں اور اس میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس پر مجھے یاد آیا کہ ۴۷-۴۸ کے سالوں میں جب میں اپنی چھوڑی ہوئی بستی کو یاد کر کے کہانیاں لکھ رہا تھا تو بزرگوں نے افسوس کیا کہ غریب ناسٹلجیا کا مارا ہوا ہے جیسے ناسٹلجیا کوئی مرض ہوتا

ہے۔ ہوتا ہوگا۔ مگر یاروں نے میرا جتنا علاج کیا اتنا ہی مرض بڑھتا گیا۔ اپنی بستی کے دنوں کو یاد کرتے کرتے میں ان دنوں کو یاد کرنے لگا جو میری پیدائش سے پہلے جگمگائے تھے اور جن کا ذکر میں نے اپنی نانی اماں سے سنا تھا۔ مرض اور بڑھا۔ ان دنوں کی یاد ستانے لگی کہ نانی اماں نے دیکھے تھے۔ یہ سب دن میرے لئے گذرے ہوئے کل تھے مگر جانے کن چور رستوں سے میرے تصور میں داخل ہو رہے تھے۔ ہوتے ہوتے بہت سے ایسے کل جو مسلمانوں کے چودہ سو برسوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ میرے تصور میں سما گئے۔ پھر یوں ہوا کہ اس برِصغیر کے ہزاروں برسوں میں سے مختلف کل میرے تصور میں رچنے لگے۔ اور بھی کل ہوں گے جو میرے اندر ہیں مگر مجھے ان کا شعور نہیں۔ سب دن اور سب زمانے ہمارے اندر رہیں۔ مگر ہم اپنی تنگ ظرفی سے انہیں مار کر ماضی بنا دیتے ہیں اور اپنے اندر دفن کر دیتے ہیں۔ ہمارا اندر ایک بڑا مدفن ہے جس میں جانے کتنے آج کل بن کر دبے پڑے ہیں۔ مجھ پر سنک سوار ہے کہ کہانی کا منتر پھونک کر سوئے ہوئے کلوں کو جگاؤ اور اپنے اس تنتھے سے جاگتے آج میں سمو لو۔ مگر پھر وہی بات کہ میں نہ ہاتھی ہوں کہ مجھے اپنے سارے کل یاد ہوں۔ نہ مہاتما بدھ ہوں کہ سارے گذرے کلوں کو سمیٹ کر ایک جگمگاتا آج بناؤں مگر چلو حسرت ہی سہی۔ اس حسرت کا حق تو مجھ سے مت چھینو۔

جب میں یوں سوچتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ الف لیلہ، آگ کا دریا۔ اور کتھا سرت ساگر، تینوں میرے ہی زمانے کی کتابیں ہیں۔ سو جیسے میر ہمعصر بلراج مینرا ویسے میرے ہمعصر سوم دیو جی۔ سو میرے بھائی یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں تمہاری خاطر اور تمہارے تنک سے آج کی خاطر سوم دیو جی کی ہمعصری سے انکار کر دوں۔ اگے تم سوچو۔

تمہارا اور سوم دیو جی کا ہمعصر انتظار حسین

